سنبل و سلاسل

جوش

باز گلبانگِ پریشاں می زنم

ناشر

شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس

محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

فہرس

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو
قاموس و لغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پہ نہیں اُڑتے معنیٰ
الفاظ کے سینوں میں اُتر کر دیکھو

آخر کس اُمید پر کنایات و نکات
کیوں لب پہ نہ لاؤں یہ گرہ بستہ کلمات
اُونچا نہ اگر تمہیں سُنائی دیتا
میں غُنچہ و شبنم کی طرح کرتا بات

شعروں کا مزا بگاڑ دیتی ہے زبان
مٹتا ہے یقین اور ابھرتا ہے گمان
لفظوں کی کسوٹی پہ زرِ معنی کو
گِھستا ہوں تو پڑ جاتے ہیں پیتل کے نشان

شعرِ خالص کا لطف کیونکر پاتے
جو رُوح میں تھے وہ گیت کیونکر گاتے
صد حیف کہ تُرش ہو گیا شہدِ خیال
الفاظ کی بوتلوں میں آتے آتے

بنامِ قوّت و حیات

نوجوانانِ کمیونسٹ پارٹی سے

نومبر ۱۹۴۵ء

خاک کے ذرّوں پہ تاروں کا گماں ہونے تو دو
دوستو ٹھہرو، زمیں کو آسماں ہونے تو دو

ناخنِ عجلت سے عقدے وقت کے کھلتے نہیں
خود کو پہلے رازبین و رازداں ہونے تو دو

غرق ہو جائے گی شیخ و برہمن کی برہمی
جوئے امواجِ اخوّت کو رواں ہونے تو دو

عرش و کرسی کی بلندی کا بھرم کھل جائے گا
پہلے سجدوں کو جبینِ آستاں ہونے تو دو

تم نے کاوش سے بنایا ہے جو یہ کوہِ گراں
اک نفس ٹھہرو اسے آتش فشاں ہونے تو دو

آنچ لہراتی نظر آئے گی سقف و بام پر
شعلۂ مفلس کو منعم پر عیاں ہونے تو دو

جن کا مرکب برق ہوگی جن کا پرچم آفتاب
خیبر سے ان کاروانوں کو رواں ہونے تو دو

دور سے لو دے اٹھے گا روئے منزل، دیکھنا
رہ روؤں کو مہ چکاں و خور فشاں ہونے تو دو

مے کدے میں اک نئے انداز سے ہوگی نماز
قلقلِ مینا کو گل بانگِ اذاں ہونے تو دو

جگمگا اُٹھے گی محرابِ خراباتِ کہن
مُغبچوں کو ہمسرِ پیرِ مغاں ہونے تو دو

محو ہو جائے گا نظمِ کہنۂ سرو و سمن
نوخرامانِ چمن کو باغباں ہونے تو دو

ثابت و سیّار بن جائیں گے ذرّاتِ چمن
کاہِ بے مایہ کو میرِ کہکشاں ہونے تو دو

گُونج اُٹھے گا سازِ عشرت سے زمین و آسماں
ہندیوں کو مُطربِ ہندوستاں ہونے تو دو

ذہنِ انسانی کے سرو ِ پا بہ گِل کو دوستو
موجِ حرفِ زندہ سے سروِ رواں ہونے تو دو

تختِ سیمیں کو جلا دیں تاجِ زر کو پھونک دیں
دل جلوں کو اس قدر آتش بجاں ہونے تو دو

کاسہ بن جائے سُبک ہوکر کلاہِ خسروی
سرگراں یاروں کو اتنا سرگراں ہونے تو دو

سُود کے چشمے اُبل پڑتے ہیں جس کے فیض سے
رُوح کو اس حد کا احساسِ زیاں ہونے تو دو

خود بخود محبوب کے اعضا میں لوچ آجائے گا
گنگناتے ولولوں کو نغمہ خواں ہونے تو دو

عربدوں کے تیر خود ہو جائیں گے سینوں کے پار
ابروئے خمدار کی دُہری کماں ہونے تو دو

خود بخود ساغر چھلک اُٹھیں گے کھل جائینگے پھول
مہ وشوں کی انکھڑیوں کو مے فشاں ہونے تو دو

عام ہو جائے گا ہاں اک روز رازِ دلبراں
ابتداً۔ درحدیثِ دیگراں ہونے تو دو

آسماں افسوں بہ لب ہوگا، زمیں افسانہ خواں
زندگی کو داستاں در داستاں ہونے تو دو

جنکی مہکوں میں ہے جادو، جن کی موجوں میں جنوں
دوش پر اُن گیسوؤں کو پر فشاں ہونے تو دو

۱۴

مسکرا کر اپنا جوڑا کھول دیگی کائنات
طفلکِ ناپختۂ ہستی کو جواں ہونے تو دو



وہ آرہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

جون سنہ ۱۹۴۶ء

وہ اک جلوس نکلا، گردوں وہ مسکرایا
وہ شبنمی افق پر رنگیں غبار چھایا
وہ سرخ آنچلوں کا پھیلا زمیں پہ سایا
چھیڑا وہ کہکشاں نے بھولا ہوا ترانہ

وہ آرہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

ظلمت پہ وہ گلابی چادر سی تن رہی ہے
گہرے پہ ایک رنگیں مورت سی بن رہی ہے
سینے سے زندگی کے اِک لَو سی چھن رہی ہے
"بر می زند ز مشرق شمعِ سحر زبانہ"

وہ آ رہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

بَرسے وہ آسماں سے دُرہائے عہدِ رَوشن
وہ حاشیے پہ دَوڑا یادوں کا رنگ و روغن
مثلِ شہاب اُترا گردوں سے نُورِ گلشن
وہ پُشتِ شب پہ بولا ماضی کا تازیانہ



وہ آرہا ہے واپس گزرا ہُوا زمانہ



دُھندلی فضا میں دَمکی وہ مشعلِ فروزاں
اُٹھنے لگیں نقابیں، اُڑنے لگے گلستاں
افشاں ہیں جَڑتے گیسو، گیسو ہیں رُوئے خوباں
افسانوں میں ہے افسُوں، افسوں میں ہے فسانہ

وہ آرہا ہے واپس، گزرا ہوا زمانہ

ہنس کر وہ آنکھ کھولی افسانہ خوانیوں نے

پچکاریاں اُٹھا لیں رنگوں کی رانیوں نے

وہ شوخ و شنگ و شیریں، شاداں جوانیوں نے

سُرخ انکھڑیوں کو مل کر کھولا شراب خانہ

وہ آ رہا ہے واپس، گزرا ہوا زمانہ



پلٹے وہ مست لمحے، گُل رنگ سبز، دھانی
چہکیں وہ آرزوئیں، لہکی وہ نوجوانی
چھٹکی دیارِ جاں میں وہ چاندنی سہانی
وہ چاندنی میں اُبھرا پھولوں کا شامیانہ



وہ آ رہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ



وہ پُر شکستہ رائیں ہونے لگیں پر افشاں

کجلائے ولولوں کے سینے ہوئے فروزاں

ذرّے بنے ستارے، کانٹے بنے گلستاں

کھولا وہ آنسوؤں نے شبنم کا کارخانہ

وہ آرہا ہے واپس، گزرا ہُوا زمانہ

۱

دوشِ ہوا پہ جُھمکے مُکھڑے وہ گورے گورے
انگڑائیاں وہ ٹُوٹیں، وہ بھر گئے کٹورے
سرشار انکھڑیوں میں دَمکے وہ سُرخ ڈورے
ڈوروں کی سُرخیوں سے چھلکی مَئے شبانہ

وہ آرہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

وقت کی آواز

(نومبر ۱۹۴۵ء)

اے دوستانِ برہم و یارانِ مُردہ ہوش
اے شعلگی بہ سینہ و آشفتگی بہ دوش
تا کے یہ غُل، یہ گونج، یہ ہنگامہ یہ خروش
کچھ کہہ رہی ہے مادرِ ہندوستاں، خموش
صد حیف وقتِ مہر بھی غصّے میں بھُوت ہو
ماں کے قریب آؤ اگر تم سپُوت ہو

بازارِ ہست و بُود میں ارزاں ہو کس لئے
اِس نرخِ شرمناک پہ نازاں ہو کس لئے
وحشت کا سیل، بُغض کا طوفاں ہو کس لئے
اِک دُوسرے سے دست و گریباں ہو کس لئے
آؤ سنو بھی مادرِ ہندوستاں کی بات
بیٹا وہی شریف ہے، مانے جو ماں کی بات

وہ کہہ رہی ہے؟ دل میں کدورت نہ چاہیے

اچھے تو کیا، بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے

کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیے

کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا

پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا

یہ خشک جھاڑیاں کہ پریشاں ہیں جا بجا
پھولوں کے خاندان سے ہیں دیکھنا ہے کیا
ٹھکرا کے برگِ زرد کو چلنا نہیں روا
اس انتہا میں دیکھ جھلکتی ہے ابتدا
کل اس ورق پہ رنگ چھڑک کر شراب کا
خاکِ چمن نے روپ بھرا تھا گلاب کا

اور تم کہ بھائیوں سے ہو مصروفِ گیر و دار
کیا زک خزاں کو دو گے کہ ہو دشمنِ بہار
کیا کھا کے بن سکے گا بھلا وہ رفیقِ خار
جس کی خوشی کا گُل کے مَسلنے پہ ہو مدار
واری، یہ غصّہ تھوک دو، یہ تناؤ چھوڑ دو
آپس کا، بن پڑے تو، یہ لیناؤ چھوڑ دو

ناقوس، گلے، باجے، تماشے، جلوس، اذاں
بنوٹ، کمند، پینترے، بانا، تبر، سناں
فلاّچیاں، جھکانیاں آوازے، آوکھیاں
اِن ہَنت کھنڈوں میں فرد ہے ہر نکس بارخاں
ہر قوم کی نگاہ سے گو گر رہے ہو تم
مونچھوں پہ تاؤ دیتے مگر پھر رہے ہو تم

غُل شور دھینگا مُشتیاں، لٹھ پونگا، مار دھاڑ
گلیاؤ، لام کاف، دَھما چوکڑی ہَتار
نیچھراؤ، داؤں پیچ، اُچھل کود، دَھر پچھاڑ
دیکھو تو اپنی صُورتیں، سر جھاڑ، منہ پہاڑ
آنکھوں کا پانی مر گیا، تو کیا ڈریگا کوئی
جب مُنہ پہ لوئی پھیر لی، پھر کیا کریگا کوئی

کیا تم کو، ناؤ قوم کی ڈوبے کہ پار ہو
تم ماورائے فکرِ خزان و بہار ہو
تم جیت جاؤ، خواہ دو عالم کی ہار ہو
تم اپنی ماں کے ہاتھ وہ تیمار دار ہو
پروا ابھی جن کو چارۂ آزار کی نہیں
صرف اپنی جن کو فکر ہے، بیمار کی نہیں

تم کو تو خیر سے ہے یہی فکرِ صبح و شام
بس پانچویں سواروں میں چھپ جائے اپنا نام

اونچی ہو اپنی بات، چھلک جائے اپنا جام
تم اپنے چلوے مانڈے سے رکھتے ہو صرف کام

تم من چلوں کو ہے تو فقط لیڈری کی دھن
ملحد ہو، پھر بھی رہتی ہے پیغمبری کی دھن

تم کو یمن کا درد، نہ لعلِ یمن کا درد
تُم کو نہ گُل کا درد، نہ سرو و سمن کا درد
تُم میں سے ایک کو بھی نہیں ہے وطن کا درد
وُہ بلبلیں ہو، جن کو نہیں ہے چمن کا درد
تُم دوڑتے ہی کب ہو کہ آؤ جھپیٹ میں
چل جائے بس تو باغ کو خود رکھ لو پیٹ میں

ہاں ہاں چلا رہے ہو بڑے طنطنے سے ناؤ

تم کتنے پانی میں ہو، میں سب جانتی ہوں، جاؤ

تُم حاکموں کو جتنا دکھاتے ہو اپنا تاؤ

اُتنا ہی سور ماؤ، بڑھاتے ہو اپنا بھاؤ

محلّوں میں لیڈروں کی بڑی مان وان ہے

منڈوا نہیں ہے، بلکہ تمہاری دکان ہے

تم بار بار دیکھتے رہتے ہو پیش و پس

سب کو پھلانگ جانے جو چلنا تمہارا بس

آتا ہے اس مزاج پہ مجھکو بڑا ترس ،

تم بلّیوں اُچھالتے ہو اس لئے فرَس

باصد شکوہ بر سرِ بازار دیکھ لیں

تا ہم کو لیڈروں کے خریدار دیکھ لیں

صد حیف ہر قدم پہ ہیں دس لاکھ ٹولیاں
جن میں سے کچھ سپنولے ہیں اور کچھ سپنولیاں
چندوں سے بھرتی رہتی ہیں دن رات جھولیاں
سب اپنی اپنی بولتے رہتے ہیں بولیاں
ان سب کو کام ہے تو فقط اپنے کام سے
کانوں پہ ہات رکھتی ہوں میں ان کے نام سے

میرے تو بس ہیں تین چمکتے ہوئے نگیں
اک کانگریس کہ ہے وہ بڑھاپے کی نازنیں
اور لیگ اُس کی پیٹ کی بچّی قمر جبیں
اور کمیونسٹ ہے مرا فرزند نکتہ بیں
سانچے میں روشنی کے ہیں گویا ڈھلے ہوئے
میرے ہی دودھ سے ہیں تینوں پلے ہوئے

(کانگریس سے خطاب)

ہاں ٹبیا کانگریس ذرا اس طرف تو آ

یہ کیا میں سن رہی ہوں کئی دن سے چرچا

چھوٹوں کا تجھکو پاس مری جاں نہیں رہا

ہاں ہاں بڑوں کا ہے یہی دستور، مرحبا

ثابت ترے پتنگ کا بیٹا نہیں رہا

کیا تجھکو ماں کا دھیان بھی بیٹا نہیں رہا

کَل جُگ ہے یہ، کسی کا نہیں کوئی ہائے اب

ہے ہے یہ انّیائے، یہ اندھیر، یہ غضب

تُو کوستی ہے بھائی کو، اور وُہ بھی بے سبب

ماں جائے کی تو خیر مناتے ہیں روز و شب

خود سوچ، کیا ملے گا تجھے اُس کو کوس کے

تُو نے بُرا کیا ہے جیسے پال پوس کے

تُو یوں تو زور دیتی ہے دل کی صفائی پر
مائل نہیں جہاں میں کسی کی بُرائی پر
دل میرا خُون ہے مگر اُس کج ادائی پر
کس جی سے تُو زبان چلاتی ہے بھائی پر
کیوں ہیں ترے نقوشِ محبّت مٹے ہُوئے
بہنوں کی چاہ کے تو ہیں ڈنکے پٹے ہُوئے

پروان چڑھ کے ہات یہ تیرا بٹائے گا
طوفان میں بھی تری کشتی چلائے گا
ساون میں تان جب کہ پپیہا سنائے گا
میکے سے ڈولی لے کے یہ بیرن بھی آئے گا
ہو جائے پھر ملاپ بہن اور بھائی میں
اُٹھ اور راکھی باندھ دے اس کی کلائی میں

سچ ہے کہ اتحاد پر ایمان ہے ترا

جیسی دُکان، ویسا ہی پکوان ہے ترا

پھیلا ہے جس میں نُور وُہ میدان ہے ترا

ہاں پُورے خاندان پر احسان ہے ترا

رُعبِ عدُو کا پنجہ مروڑے ہوُئے ہے تُو

اغیار کے غرُور کو توڑے ہوُئے ہے تُو

کڑکا چکی ہے جنگ میں سو بار تو کماں
سر کر چکی ہے معرکۂ کاہ و کہکشاں
وا کر چکی ہے ہر شکنِ زلف این و آں
باقی جو ہیں تو صرف اب آنکھوں کی سوئیاں
لیلائے آب و رنگ کا ڈیرا فریب ہے
تارے لرز رہے ہیں، سویرا قریب ہے

تُو نے ہی طرزِ کُہنہ کی کاٹی ہیں بیڑیاں

تُو نے ہی قطع کی ہے نحوست کی رسیاں

خودداریوں کی تُو نے ہی چھیڑی ہے داستاں

تیری ہی بادِ صُبح سے مہکا ہے بوستاں

جاگی ہے تیری چاپ سے دُنیا جمال کی

چٹکی ہیں تیری سانس سے کلیاں خیال کی

فقرِ گدا میں شانِ کیانی تجھی سے ہے

پیری کی ہڈیوں میں جوانی تجھی سے ہے

دریائے کشمکش میں روانی تجھی سے ہے

زہرہ عدو کی آگ کا پانی تجھی سے ہے

گردن کے خم سے تیغ کو نیچا دکھا دیا

تُو وہ ہے جس نے موم سے لوہا جھکا دیا

مجھکو تو کیا، کسی کو بھی اس میں نہیں کلام
تلوار سب سے پہلے ہوئی تیری بے نیام
تُو نے ہی سب سے پہلے لیا حرّیت کا نام
تُو جملہ اہلِ عزم کی ہے اوّلیں امام
تیرے ہی حرفِ گرم کا سینوں میں شور ہے
احسان بھول جائے جو تیرا وہ کور ہے

لیکن بس ایک بات سے لگتا ہے مجکو ڈر
بدلی ہوئی ہے دیر سے بیمار کی نظر
مندر کی پاسبان ہے مسجد سے بے خبر
تسبیح پہ ہے قہر، جنیو پہ ہے نظر
اس میرے اعتراض کو دل سے قبول کر
گنگا کی رو پہ مست ہے، کوثر کو بھول کر

ہاں جانتی ہوں میں تری نیّت بُری نہیں

تیرا بطون صاف ہے، روشن تری جبیں،

لیکن ترے مکاں میں ہیں کچھ دن سے وہ مکیں

جو دوستانِ دھرم ہیں اور دشمنانِ دیں

وضعِ غلط پہ بار ہے تیرا گُندھا ہوا

اس بار سے اذاں کا گلا ہے رندھا ہوا

یُوں تو نہیں ملے گی کبھی منزلِ نجات

جگنوں کی اپنے بل پہ، یہ باتیں ہیں واہیات

راتوں کو دن بنا کے، دنوں کو بنا نہ رات

کہتی ہے ایک بات تو کرتی ہے ایک بات

دل تو وہ شے ہے غیر سے بھی صاف چاہیئے

گر یہ نہ ہو تو گھر میں تو انصاف چاہیئے

رانی ہے جس کا نام وُہ مُردار ہے بڑی
ہشکانے سے اُسی کے مچی ہے یہ گڑبڑی
وُہ اک نہ ایک چھوڑتی رہتی ہے پھُل جھڑی
ہاں پھُنس میں چنگی ڈال جمالو الگ کھڑی
گرجا کی شہ پہ جنگ حرم اور دَیر کی!
اپنوں سے کوئی لڑتا ہے پُرچک پہ غیر کی

گرگٹ ہے، اُس کی ڈھول کا کھلنا نہیں ہے پول
چھریاں بھری ہیں دل میں، زباں پر ہیں میٹھے بول
آج اور سے ٹھٹھول ہے، کل اور سے ٹھٹھول
آج اس سے میل جول ہے، کل اُس سے میل جول
تکیہ کبھی نہ کیجیو اُس اجلی چیل پر
گنگا پہ بیٹھتی ہے، کبھی جا کے نیل پر

میٹھی ہے وہ زبان کی، دل کی کٹھور ہے
قطّامہ ہے، چڑیل ہے، شفتل ہے، چور ہے
ڈگڈگی اُس میں گھات ہے، ڈائن کا زور ہے
اُس کا نہ اور ہے کوئی بیٹا نہ چھور ہے
نا دہندی کی بھی ہے وہ نانی، سمجھ گئی؟
پیچھے کچھ اور، مُنہ پہ ممانی، سمجھ گئی؟

چیلیں تو کیا، گدھوں کے وہ کاٹے ہوئے ہے کان
اُس کے پروں کی آنچ سے جلتا ہے آسمان
سیلون تک یہاں سے تو اُس کی ہے اک اُڑان
ہشیار رہ، بڑی ہی وہ لنکا ہے میری جان
تھگلی لگاتی رہتی ہے وہ آسمان پر
اللہ میرا صبر پڑے اُس کی جان پر

ہاں اس سے تو میں خوش ہوں کہ کاٹی ہے تو نے جیل

لیکن شگون بد ہے روپے کی یہ ریل پیل

تو کچھ دنوں سے کھیل رہی ہے عجیب کھیل

بیٹا ہما جنوں سے مناسب نہیں یہ میل

اتنا قریب ہو کے بھی پہچانتی نہیں

ان کے دلوں میں کھوٹ ہے، تو جانتی نہیں

۱۰۱۲

جنگ و وبا و قحط سے یہ کھینچتے ہیں زر،
ٹکسال اِن کے حق میں ہے میدانِ شور و شر
اوروں کی لاغری سے انہیں فربہی کا ڈر
یہ دوسروں کو لوٹ کے بھرتے ہیں اپنا گھر
یہ نفع خور کوئلے تک کو چُراتے ہیں
حد ہے برہنگی سے یہ خلعت بناتے ہیں

یہ ان کے ہاتی دانت کے ساماں، الاماں
ان میں ہیں بے شمار غریبوں کی ہڈیاں
یہ ان کے طاق ہیں ہے جو مشعل قمر چکاں
اس میں ہے کتنے سینوں سے اٹھتا ہوا دھواں
روشن اسی سے ان کے دلوں کی صفائی ہے
کتنی لویں چرا کے یہ مشعل بنائی ہے

رسم اِن حرام خوروں سے، یہ کیا جنون ہے

جن کا ضمیر کج، متعفن بطون ہے

مبنی فسادِ خلق پہ جن کا سکون ہے

جن کی ہر اشرفی میں غریبوں کا خون ہے

اوروں کی بھوک سے ہیں یہ روٹی لئے ہوئے

دنیا کی پیاس سے ہیں یہ پانی پیئے ہوئے

اِن کا محل ہے خاک کی چھاتی پر ایک سِل
اِن کا چراغ، تیرگیِ بزمِ آب و گِل!
محلوں میں پل رہے ہیں یہ پردے جو متّصل
ان میں دھڑک رہے ہیں مصیبت زدوں کے دل
اِن کے لبِ زبوں پہ جو نَے ہے دھری ہوئی
اُس میں بلاکشوں کی ہیں آہیں بھری ہوئی

ہوتا ہے ان نگوڑوں کا چل اور ان خراب

پاپی ہیں ان موؤں کا ہے ان اور دھن خراب

ان سب کا تن خراب ہے، ان سب کا من خراب

ان کی نظر خراب ہے، ان کا چلن خراب

دیکھ ان سے اب نظر بھی ملانا تو قہر سے

ان کا لہو سفید ہے چاندی کے زہر سے

دریا دلی سے آج تو یہ دے رہے ہیں دام

کل تجھ کو حکم دیں گے کہ اب آ ہمارے کام

مزدوروں کے جلائے نہ تو نے اگر خیام

یہ لوگ منہ پہ تجھ کو کہیں گے نمک حرام

کل ان کے موٹروں کے مزے خوب آئینگے

خود تجھ کو جب یہ اپنی سواری بنائینگے

یہ کون سی ادا ہے ذرا سوچ میری جاں

غیرت کے مارے میری سلگتی ہیں ہڈیاں

ہر صبح لکھ رہی ہے کوئی تیرا میزباں

ہر شب کسی کروڑ پتی کی ہے میہماں

کیوں تیرے قدرداں ہیں یہ سوچتی بھی ہے

کیوں تجھ پہ مہرباں ہیں یہ سوچتی بھی ہے

ہر اُن کی چیز قرض ہے ہر شے اُدھار ہے

جو بوجھ اُتر رہا ہے وہ اِک تازہ بار ہے

ایک ایک قطرہ وقفِ حسابِ شمار ہے

"خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار" ہے

دیگی بڑا معاوضہ اِس نان و آب کا

دن ہوگا روزِ حشر سے بڑھ کر حساب کا

ایک ایک جھن جھی کوڑی پہ جاتی ہے انکی جان
رکھتے نہیں ہیں مفت کسی کو یہ میہمان
تو جانتی ہے مفت کی ہے سب یہ پان دان؟
کھاتوں پہ چڑھ رہا ہے اری ایک ایک پان
تجھ سے جو ملنے آتے ہیں تیری جناب میں
لکھتی ہے اُن کی لونگ بھی نیرے حساب میں

تکیہ تو لا جواب ہے یہ قرض کا ستون
ہاں خوب ہے اُدھار کا یہ دل نشیں سکون
پر اِس کو یاد رکھ کہ یہ اچھا نہیں شگون
کل دیگی اس کے سُود میں محنت کشوں کا خُون
پی پی کے سُود، تیری حکومت کے دَور میں
مانگیں گے "اصل" صورتِ قانونِ جَور میں

ہاتوں سے تیرے موت غریبوں کی آئیگی

تو ہر روش پہ سات مہاجن کے جائے گی

اِس کو سدا بڑھائیگی، اُس کو گھٹائے گی

ظاہر ہے جس کا کھائیگی اُس کا بجائے گی

یہ بنئے، انگلیوں پہ تجھے کل نچائیں گے

اپنی ملوں میں تجھ سے یہ جھاڑو دلائیں گے

اِس چال میں بگاڑ ہے یہ چال ہاں نہ چل
جس نے چلی یہ چال گرا بس وہ مُنہ کے بل

کیوں کھا رہی ہے دولتِ لالہ کڑوڑمل
ایک ایک پائی دیکھ اُگلنا پڑے کی کل

تُو جانتی ہے سُرخی مے بن کے نکلے گا؟
لالہ کا سونا، خُون کی قے بن کے نکلے گا

اور لیگ سے تبا تو یہ کیا آنا کافی ہے

چھوٹوں کی ضد بڑوں نے ہمیشہ سے مانی ہے

اُس چھوکری کی تو ابھی الھڑ جوانی ہے

تو آنکھوں خاک، سِن میں بڑی سیانی ہے

کہتی نہیں کہ لعل و گہر اُس کو بخش دے

جو گھر وہ مانگتی ہے وہ گھر اُس کو بخش دے

دُنیا میں سب کو فکر بقائے زباں کی ہے

دل میں لگن تحفّظِ نام و نشاں کی ہے

دُھن سب کو ایک حلقۂ امن و اماں کی ہے

حاجت ہر ایک فردِ بشر کو مکاں کی ہے

تُو کہہ رہی ہے اِس کی ضرورت نہیں کوئی

جز اِس کے زندہ رہنے کی صورت نہیں کوئی

اِس کے علاوہ یُوں بھی تو ہے زندگی وبال
تُم دونوں ہی کی رہتی ہیں آنکھیں ہمیشہ لال
بہنیں ہیں ہم کبھی نہیں آتا تمہیں خیال
جب دیکھو ٹھنتی رہتی ہے بس جُوتیوں میں دال
بک بک ہے چِل چخ ہے مُنہ زوریں ہیں نوچ ہے
دِن رات طعنے تشنے ہیں گالم گلوچ ہے

ہنسنے پہ تم میں جنگ ہے، رونے پہ جنگ ہے

پانے پہ تم میں جنگ ہے، کھونے پہ جنگ ہے

سینے پہ جنگ، تاگا پرونے پہ جنگ ہے

پانی پہ جنگ، پوتڑے دھونے پہ جنگ ہے

جس سے کہ دیدے لال ہیں، اور منہ طباق ہے

ایسے نگوڑے وصل سے بہتر فراق ہے

تُو میل چاہتی ہے تو یہ میری بات مان
ہوتا ہے جڑ فساد کی مشترکہ خاندان
تُو چاہتی ہے دونوں کا ہو ایک ہی مکان !
وہ سونا جائے بھاڑ میں جس سے کہ ٹوٹیں کان
ہو گی جُدا تو ہو گا مزے سے نباہ بھی
نکلے گی تم میں اس سے محبت کی راہ بھی

ہاں لیگ کو بھی حق ہے کہ وہ اپنا گھر بنائے
بچوں کو اپنے اپنی زباں، اپنے فن سکھائے
حسبِ مراد اپنی تمنّاؤں کو جگائے
اپنے محل کے طاق میں اپنے کنول جلائے
تانوں کو اپنے ڈھب سے گھٹا اور بڑھا سکے
اُس کی پسند کے ہیں جو گانے وہ گا سکے

میں خوب جانتی ہوں کہ ہے کیوں یہ ڈھیل ڈھال
پہچانتی ہوں خوب کبیرؔا، نری یہ چال
"پڑ جائیگا بچھڑ کے صغیرؔا کے گھر میں کال
کیا دھوپ میں سفید ہوئے ہیں مرے یہ بال
پتھر کی طرح سخت ہوں ڈھیلا نہیں ہوں میں
چندؔلا نے مجھ کو بیٹھی ہے کھیلا نہیں ہوں میں

اچھّی نہیں ہے دیکھ یہ آپس کی دشمنی
چھوٹی بہن ہے تیری قیامت کی کٹ کھنی
کچھ روز تک جو اور رہے گی تنا تنی
سُن لے کہ رنگ لائے گی کل یہ کٹا چھنی

دانا نہیں جو خود کو بلاؤں میں راندھ لے
اِس میں سے مُنہ کی بات کو پلّو میں باندھ لے

چھوٹی کی ہٹ غلط ہے یہ باتیں ہیں واہیات
دشمن کی ہے وہ دوست یہ ہے دھاندلی کی بات
وہ بات کر کہ مجھ کو ملے قید سے نجات
اس میرے بوڑھے چونڈے کی عزت ہے تیرے ہات
دل اس کا دور پار کہیں چاک ہو نہ جائے
دھڑکا ہے یہ کہ لاکھ کا گھر خاک ہو نہ جائے

بنتی ہے حصّے بخرے میں کیوں اِس قدر پہ چیت
جو اپنی چیز مانگے وہ ٹھہرے ترا پلیٹ
بس تو ہی ایک شاہ ہے چھوٹی نری ڈکیت
آنکھوں میں گھس رہی ہے اری جُوتیوں سمیت
تھپڑی بجے گی، تھوکے گی دُنیا، یہ جان لے
ٹھُڈّی میں ہات ڈال کے کہتی ہوں، مان لے

خود دیکھ اپنے اُس کے ترانوں میں اختلاف

وہموں میں اختلاف، گمانوں میں اختلاف

قصّوں میں اختلاف فسانوں میں اختلاف

لہجوں میں اختلاف، زبانوں میں اختلاف

ہو ایک ہی روش پہ مگر چال اور ہے

گو مائیکا تو ایک ہے سسرال اور ہے

وضع و طریق، حرف و حکایت، شگون و فال

اندازِ نطق، طرزِ عمل، جادۂ خیال

رسم و رواج، دین و روایات، قیل و قال

اُٹھ بیٹھ، بات چیت، لب و لہجہ، چال ڈھال

تُم میں ہر ایک چیز جُدا، ہر چلن جُدا

دونوں کے پھول پات جُدا ہیں، چمن جُدا

تو شہدِ آب و گنگ و جمن ہے پیتے ہوئے
اُس کا سبو ہے زمزم و کوثر لئے ہوئے
ویدوں سے آسمان کے لب تو سِیے ہوئے
وُہ اِس زمین پر ہے حکومت کیے ہوئے
یہ تو غلط کہ اس کی ضرورت نہیں کوئی
پر ساتھ رہنے کی ابھی صورت نہیں کوئی

ملتا نہیں ہے لیگ سے تیرا طریق و طور

ہے داہنے سے بائیں وہاں مے کشی کا دور

موٹی سی ہے یہ بات ذرا کر تو دل میں غور

اُس کا مزاج اور ہے تیرا مزاج اور

پھل صبح و شام چھوٹ کا چکھنے سے فائدہ؟

چھوٹی بہن کو گھونٹ کے رکھنے سے فائدہ؟

چلتی نہیں ہے ایک ہی ڈھرے پہ زندگی

اِک وضع پر نہیں ہے مدارِ غم و خوشی

میرا یہ تجربہ ہے کہ ہر بُعد عارضی

بنتا ہے ایک دن سببِ قُربِ دائمی

ہر بُعد موڑتا ہے عداوت کی دھار کو

دھو دیتا ہے فراق دلوں کے غُبار کو

چھائی ہے تیرے باغ پہ بدلی، نہ چھائے گی

منہ پر ترے مٹھاس نہ آئی، نہ آئے گی

چھوٹی بہن مُراد نہ جب تک کہ پائے گی

بیٹیا، یہ روز روز کی کِل کِل نہ جائے گی

ہر نہج سے غلط کہ حضوری ہی خوب ہے

قُربت میں ہو فساد تو دُوری ہی خوب ہے

(لیگ سے خطاب)

اور ہاں یہ کیا قرینہ ہے اے لیگ اِدھر تو آ

رہنا ہے تیری بزم میں کیسا یہ جسم گھٹا

یہ طور اک آنکھ بھی مجھے بھاتا نہیں ترا

یہ رنگ رَلیاں، اور امیروں سے واہ، وا

اُن کا سفینہ اور تری پاک رَو دمیں

جو بَد گُہر پلے ہیں حکومت کی گود میں

ٹوٹے دلوں کو مہر و محبّت سے جوڑ دے

دشمن کا جو رفیق ہو، اُس کو جھنجھوڑ دے

جس رشتے میں ہے جی کا زیاں اُسکو توڑ دے

"نوابوں اور سروں" سے یہ دھمال چھوڑ دے

دیکھ آنکھیں کھول کر یہ ترے کام کے نہیں

یہ کُفر کے غُلام ہیں، اسلام کے نہیں

محروم ہیں یہ خُلق کے ابرِ مُطیر سے

زہریلی بھاپ اُٹھتی ہے اِن کے خمیر سے

شب اُخذِ ہول کرتی ہے اِن کے ضمیر سے

پتھر کے بن چکے ہیں یہ لمسِ حریر سے

وہ اِک وبا ہیں دائرۂ قدر و جبر میں

رہتے ہیں جو مسہری[1] و موٹر کی قبر میں

[1] میں اس ترکیب میں کوئی صوتی نقص نہیں پاتا اس لیے جائز سمجھتا ہوں

دروازے جن کے رہتے ہیں مخلوق پر بھڑے

بڑبولے، بکّی، زبیٹیے، گپّی، ڈرل، زِڑے

ضِدّی، زباں دراز، زبوں عقل، مُرچِڑے

بے مغز، بدلگام، زبوں سرپھرے، سِڑے

مُردار خواریوں کے بڑے معتقد ہیں یہ

وِرثے کے ڈھور سے جو پلے ہیں وہ گِدھ ہیں یہ

اُف یہ "سرانِ" خود سر و خانانِ بد لگام
رہتے ہیں مست جامِ ہوس سے یہ صبح و شام
عزّت پہ حرف لاتے ہیں ان کی گرہ کے دام
اَوباش مَردُوَدوں میں بہو بیٹیوں کا کام
ان کی گلی سے ہو کے گزُرنا بھی عیب ہے
ان کے موئے پڑوس میں مرنا بھی عیب ہے

بھڑووں کے ہیں یہ دوست، حکومت کے خوشہ چیں

دیکھو تو حُر، چھوؤ تو غلامانِ کمتریں

سینوں میں جُبن، جسم پہ شیروں کی پوستیں

تیرے تو کیا، جز اپنے کسی کے بھی یہ نہیں

لاکھوں ہی بزدلی کے ہیں بچے جنے ہوئے

بیٹھے ہیں یہ جو "خان بہادر" بنے ہوئے

اور ہاں، ادب کا نقش مٹاتا نہیں کوئی
تہذیب کا منارا گراتا نہیں کوئی
حرفِ زبوں زبان پہ لاتا نہیں کوئی
اپنے بڑوں کے منہ کبھی آتا نہیں کوئی
چھوٹوں میں سرکشی کی نہ بُو باس چاہئے
اپنی بڑی بہن کا تجھے پاس چاہئے

چھوٹے بڑے کا دھیان رہے خاندان میں
آئے نہ دے ذرا بھی کمی مان دان میں
روشن ادب کا نام ہے دنیا جہان میں
بیٹی اگر مزا ہے تو میٹھی زبان میں
چھوٹی ہے تو، غلط ہے کہ یوں تن کے بات کر
بھولنے سے چھوٹی بہن بن کے بات کر

ہاں کانگریس کو آئیگی اور عقل آئے گی
اِک روز تجھ کو بڑھ کے گلے سے لگائے گی
مُنہ مانگی ہر مُراد مری جان پائے گی
وہ آج مانتی نہیں، کل مان جائے گی

لڑکی، کوئی سواد نہیں اس دِھٹائی میں
بِلّی بھی مُنہ پہ رکھتی ہے پنجہ لڑائی میں

ہاں ٹھیک، گھر کو آگ لگانا نہ چاہیئے

اپنوں کو سچ ہے غیر بنانا نہ چاہیئے

سسرال سے نگاہ پھرانا نہ چاہیئے

پر مائکے کا حق بھی بھلانا نہ چاہیئے

مُنہ اُس سے پھیر بیٹھی ہے کب سے لڑی ہوئی

جس مائکے میں نال ہے تیری گڑی ہوئی

جاری رہینگی یوں نہیں جو ہر آن دھمکیاں
اُلجھی یوں نہیں رہے گی جو ناقوس سے اذاں
قینچی کی طرح چلتی رہے گی اگر زباں
کرتی رہیگی سیدھی فرنگی کی جوتیاں
مر کر بھی زندہ راگنی چھیڑی نہ جائے گی
گردن کا طوق، پاؤں کی بیڑی نہ جائیگی

(کمیونسٹ سے خطاب)

اور تو اداس اداس ہے کیوں کمیونسٹ لال
صورت دھواں دھواں ہے تو اُلجھے ہوئے ہیں بال
ہے ہے یہ کم سنی کا زمانہ، یہ زرد گال
تو جوتیاں بنائے تو حاضر ہے میری کھال
کیوں سرخیوں کی دھار ہے بٹیا مڑی ہوئی
کیسی ہوائیاں ہیں یہ منہ پر اُڑی ہوئی

میری تو تو ہی سیف ہے، تو ہی مرا قلم

تو سب سے بڑھ کے عقل میں ہے سن میں سب سے کم

بہنیں اگر نہیں تو نہ ہوں مائلِ کرم

تو اُف نہ کرنا، دیکھ مری جان کی قسم

جھکتے ہیں ماں سمجھ کے اکڑتے نہیں ہیں بھائی

بہنوں کی جھڑکیوں پہ بگڑتے نہیں ہیں بھائی

تُو یوں اُداس ہو گا تو کیسے چلے گا کام
گردش میں کیسے آئے گا تہذیبِ نَو کا جام
کیونکر بنیں گے خاک کے ذرّے ستارہ فام
اُٹھ، اور شعلہ گام ہو اے طفلِ نَم خرام
سادات وہ ہیں، اُن میں علم اپنے گاڑ کے
رکھ دیتے ہیں جو شیر کے کلّے کو پھاڑ کے

تُو گھر کے خستہ حال غریبوں کا غم گسار

تُو سرکشوں کے حلق پہ شمشیرِ آبدار

تُو تشنہ جاں زمیں کے لئے بذلِ آبشار

مظلوم کا سکون، تُو ظالم کا انتشار

طوفاں کا تیرے ابرِ سرِ کوہسار پر

تُو موت کا طمانچہ رُخِ شہریار پر

تیرا شگوفہ زار نیا، بوستاں نیا

تیرا نشانِ راہ نیا، کارواں نیا

تیرا طریقِ فکر نیا، ارمغاں نیا

تیری زمیں نئی ہے، ترا آسماں نیا

لپٹیں ترے دماغ میں پاکیزہ رائے کی

بُو تیرے پاس اُونٹ کی ہے اور نہ گائے کی

شعلے تری نگاہ سے بن جائیں گے سحاب
پژمردگیٔ شیب پہ کھل جائے گا شباب
محنت کے زرد اُفق سے بصد شانِ انقلاب
اُبھرے گا ایک روز ترا سُرخ آفتاب
گُندھتے پہ ہے شعاعوں کا سہرا ترے لئے
پھر سے جوان ہوگی زُلیخا ترے لئے

جلد آئے وہ گھڑی کہ مرا پاسباں ہو تُو
میرے چمن میں موجۂ آبِ رواں ہو تُو
نورِ زمین و مشعلۂ آسماں ہو تُو
میری جبیں کا انجمِ گوہر فشاں ہو تُو
ہاں اپنے سر پہ لال پھریرا اڑائے تُو
ماں کے برہنہ ہاتوں میں کنگن پنہائے تُو

اِس کا مگر خیال رہے وقتِ سرخوشی
خُم میں نئی شراب ہو، ساغر رہیں یہی
میری ہی کنگھیوں سے بنے زُلفِ زندگی
میرے ہی جملہ ساز ہوں میری ہی راگنی
تازہ ہوں اصطلاحیں، مقولے یہی رہیں
شاخیں نئی ضرور ہوں جھولے یہی رہیں

مٹ جائے جب کہ نام و نشاں تخت و تاج کا

ہاں بھولنا اقوام نہ اپنی سماج کا

کل کی جبیں پہ نقش ہو اک گو نہ آج کا

دستورِ نَو میں رنگ ہو میرے مزاج کا

پردیسیوں کی بوتلوں میں ڈاٹ ہو تری

کپڑا تو روس کا ہو، مگر کاٹ ہو تری

ہاں غم کشوں کے ضعف پہ جانا نہ میری جاں

یہ زردیاں ہیں تشنگیٔ خونِ مقبلاں

آہن کا کارخانہ ہیں بشکستہ ہڈیاں

غلطاں ہیں ان کے گرم پسینے میں بجلیاں

دیکھے گا سرفرازوں کی نبضیں رکی ہوئی

جس وقت سیدھی ہونگی یہ کمریں جھکی ہوئی

کہتی ہوں پھر یہ دھیان رہے تجھکو ماں نثار
آئے مری زباں میں نویدِ کشودِ کار
جب محفلِ جدید میں ہو جشنِ نوبہار
جنبش میں آئیں میری ہی سارنگیوں کے تار
شامِ اودھ کی انکھڑیوں میں رس بھی رہے
بیٹا نسیمِ صبحِ بنارس بھی رہے

بلبل میں پڑھ کے جلدی جواں ہو تو
اے لال کب سے ہے ترے سہرے کی آرزو
گھر اپنے لاؤں بیاہ کے میں چاند سی بہو
گھوڑے پہ تو چڑھے تو بڑھے میری آبرو
چٹکے تری کلی تو مہک جائے تن مرا
بھیگیں تری مسیں تو ہرا ہو چمن مرا

اپنی دُلھن کو پنجۂ لنکا سے دے نجات[1]
اُٹھ اور اُٹھ کے پھونک دے راون کی کائنات
آنکھوں میں آگ رُخ پہ ہو آہن شکن ثبات
اور ہو زباں پہ نعرۂ یا قوت و حیات
بڑھیا وہ رن پڑے کہ زمیں کانپنے لگے
کیسی زمین، چرخِ بریں کانپنے لگے

[1] آزادی

میری دُعائیں جب تجھے دُولہا بنائینگی

برسے گا نُور، ڈومنیاں گیت گائینگی

بچّوں کے غل میں سالیاں جُوتے چرائینگی

بہنیں بھی نیگ مانگنے اُس وقت آئینگی

سمجھونگی مجھ پہ حق کا یہ احساں ٹرا ہُوا

دیکھونگی تجھ پہ اُن کا جب آنچل پڑا ہُوا

اپنی نئی شراب سے دُنیا کو مست کر
فاتح کو جلد صیدِ زبونِ شکست کر
اپنے شکاریوں کے ارادوں کو پست کر
کیوں دوڑتا ہے شیر کے مانند جست کر
شُعلے کی طرح گرم فضا سے بھڑک کے گر
بجلی ہے تُو سپاہِ عدو پر کڑک کے گر

اُٹھ، اور ہلا کے رکھ دے یہ میدانِ ہست و بُود

اغیار کو پیامِ عدم دے ترا وجُود

بیٹا، ذرا بھی خون میں آیا اگر جمُود

کہتی ہوں صاف صاف کہ بخشُوں گی میں نہ دُودھ[1]

اُٹھ، خونِ انقلاب کا کس بل لئے ہُوئے

آندھی کا شور، آگ کی ہلچل لئے ہُوئے

[1] دُودھ کی ہائے ملفوظ ملفوظ نہیں اس لئے قافیہ درست ہے ۔

رانی مٹکتی پھرتی ہے پہنے ہوئے کپڑے
چھینے ہیں اُس نے مجھ سے ہی یہ سب کپڑے چھپڑے
دُکھ مجھ کو اِس موئی نے دیئے ہیں بڑے بڑے
مُردار کو نکال دے گھر سے کھڑے کھڑے
لازم نہیں کہ تیر و تبر سے نکال دے
پر ناک چوٹی کاٹ کے گھر سے نکال دے

اُٹھ، اور اِن جمود کے پودوں کو جھوڑ دے

ہلچل سے ولولوں کی زمینوں کو گوڑ دے

بڑھ، اور طوق کاٹ دے، زنجیر توڑ دے

رختِ شہاں پر آگ کا دامن نچوڑ دے

ہاں جا، عرق سے اپنے گڑھے پاٹتا ہوا

اور آپ سینہ لو کے لہو کاٹتا ہوا

تا کے یہ بھوک پیاس یہ بیماریاں یہ کال

کب تک یہ بے حیائی یہ ذلّت یہ انفعال

سر سے کفن کو باندھ کے لے ہات میں کُدال

چاندی کی بارگاہ پہ لوہے کا عکس ڈال

محلوں کی شنگ لبستہ کلائی مروڑ دے

قبّوں کو اُٹھ حباب کے مانند توڑ دے

تیری گرہ میں فتح و ظفر ہے یہ جان لے
ترکش میں تیر، دوش پہ بھاری کمان لے
لڑنا ہے مجکو موت سے دل میں یہ ٹھان لے
دانتوں پہ دانت بھینچ لے سینے کو تان لے
رنگِ عدو کو تیغ کے پانی میں گھول دے
ہاں آستیں الٹ کے پھریرے کو کھول دے

اللہ ری موجِ آتشِ آہنگِ نوجواں

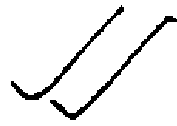
اُٹھتا ہے جسکے سائے میں شبنم سے بھی دُھواں

جُنبش میں جب شباب کا آتا ہے کارواں

دشت و جبل کی بولنے لگتی ہیں ہڈّیاں

طوفاں پہ بند باندھ کے پانی کو روک لے

کس کی مجال ہے کہ جوانی کو روک لے



یاد ہے اب تک

جنوری ۱۹۴۵ء

یاد ہے اب تک وہ اُس کے یک بیک آنے کی رات
دفعتہً وہ غنچۂ دل کے چٹک جانے کی رات

سیکڑوں کھونے کی راتوں کے ستم سہنے کے بعد
کتنی برنائی سے آئی تھی وہ اِک پانے کی رات

وہ گھنیری مست زلفوں کی مہکتی چھاؤں میں
گنگنانے مسکرانے جھومنے گانے کی رات

شب کی ہیلائے خموشی میں وہ سرگوشی کا نور
زلفِ افسوں گر کی لہروں میں وہ افسانے کی رات
وہ چمکتی مدھ بھری آنکھوں کی گردش کے حضور
دور میں آئے ہوئے سرشار پیمانے کی رات
ناز کے زانوئے جاں پرور پہ وہ فرقِ نیاز
شمع کے آغوشِ تاباں میں وہ پروانے کی رات
اِس طرف رُخ پر تمنّا کی گرہ کھلنے کی دھوم
اُس طرف گھبرا کے وہ زلفیں بکھر جانے کی رات
دیر سے سوئی ہوئی دُنیا کی خلوت گاہ میں
عشق کی جاگی ہوئی قسمت پر اترانے کی رات

عارضوں کے تازہ پھولوں میں وہ کھلانے کی صبح
انکھڑیوں کے سرخ ڈوروں میں وہ میخانے کی رات

اِس طرف لہرا کے زلفیں چوم لینا شوق کا
اُس طرف بل کھا کے چادر میں لپٹ جانے کی رات

میرے ماتھے سے وہ اک لب تشنہ آنچ اُٹھنے کا رنگ
اُن کے ہونٹوں سے وہ اِک بھیگی مہک آنے کی رات

اِس طرف گستاخ دستی کی وہ آنکھوں میں چمک
اُس طرف ڈر کر وہ پلکوں کے جھپک جانے کی رات

اِس طرف بڑھ کر وہ دامن تھام لینے کا خروش
اُس طرف پچھلے قدم ہٹ کر وہ گھبرانے کی رات

وہ جبیں پر کاکلوں کی چھاؤں پڑنا بار بار
وہ گھٹائیں چاند کے رہ رہ کے چھپ جانے کی رات

✓ عرش پر تھم تھم کے وہ آویزشِ ابر و قمر
فرش پر رہ رہ کے وہ انگڑائیاں آنے کی رات

گردشِ چشمِ صنم سے برہمن کے گرد و پیش
عود کی لپٹوں میں وہ رقصندہ بُتخانے کی رات

✓ جوشِ تجھ سار تند اور یہ صبحِ بیداریٔ عقل
ہائے وہ بیہوشیوں کے ہوش میں آنے کی رات

رفیقۂ حیات سے

فروری ۱۹۴۶ء

اے مری شمعِ شبستاں، تیرے دل میں اور یہ بات
یعنی اب کم ہو چلا ہے تجھ سے میرا التفات
پڑ چلا ہے تیرے چہرے پر جو عکسِ ماہ و سال
اُس نے مجھ کو میرے دل میں کر دیا ہے پائمال
الاماں! بندے کی فطرت سے اور اِتنا سوءِ ظن
اے انیسِ پاک فطرت! اے رفیقِ پاک تن

تُو مرے بچّوں کی ماں ہے میرے گھر کی روشنی
اور بہو ہے تو مرے خُلد آشیاں ماں باپ کی
تُو ہے ضامن میرے ہر آغاز ہر انجام کی
تجھ پہ ہے بُنیاد میری نسل میرے نام کی
کھِتی ہے تُو نے نہ جانے کتنے طوفانوں میں ناؤ
تیرے دل میں کس قدر ہیں میرے رُمانوں کے گھاؤ
میری رنگینی کے ہاتوں مُدّتوں شام و سحر
تیرے دل سے خون کی ٹپکی ہیں بوندیں کس قدر
میری شب گردی کے طوفانوں میں اے شمعِ حرم
نُوح کی کشتی سے بڑھ کر تُو رہی ثابت قدم

تیرے حلقوں لیکن اے شائستۂ صد احترام
میں نے کتنے توڑ ڈالے ہیں گھنی زلفوں کے دام
اور بے بنیاد ہے یہ بھی نرا وہم و گماں
یعنی اپنے کو سمجھتا ہوں میں اب تک نوجواں
سچ ہے میں کم عقل ہوں لیکن مری شمعِ مبیں
نوجواں اپنے کو سمجھوں اس قدر احمق نہیں
وقت کے سفّاک دھارے کو پکڑ سکتا ہے کون
سیلِ ماہ و سال سے دُنیا میں لڑ سکتا ہے کون
وہ مہکتی رات، وہ چبھتی کہانی، ہائے ہائے
نوجوانی، نوجوانی، نوجوانی، ہائے ہائے

جا چکا ہے کاروانِ عہدِ گُل دُور اِس قدر
اب تو اُس کی گرد بھی آتی نہیں مجھ کو نظر
نُورِ میرا وقت کے قدموں کے نیچے ہے دو نیم
مُدّتوں سے اب تو اپنی تیرگی میں ہُوں مُقیم
لیکن اِس دِل میں مرے پنہاں ہے اک طفلِ عجیب
دُور ہے جو راہِ تمکیں سے، تلاطم سے قریب
طفل ہو کر مجھ سے نکتہ رس کو بہکاتا ہے وُہ
مجکو پھُسلا کر بُری راہوں پہ لے جاتا ہے وہ
بِلبِلا اُٹھتا ہے شیرینی کے دونوں کیلئے
ایڑیاں اکثر رگڑتا ہے کھِلونوں کے لیئے

"جھل جھلا نے بھول سے کپڑے منگا دو خوش خاں
لال لال آئینے لچکے کی دو پلی ٹوپیاں"

"ہم نہیں کچھ جانتے، اوں آوں ابھی لا دو ہمیں
ہنسنے ہوئے، بولتی گڑیاں، چہکتی بلبلیں"

"ناؤ میں بیٹھیں گے ریلوں میں ہوا کھائیں گے ہم
نہر پر ناچیں گے، میلے دیکھنے جائیں گے ہم"

"کیا تمہارا جاتا ہے گھر کو نہیں، ٹو کو نہیں
حوض میں ننگے نہائیں گے ہمیں، رد کو نہیں"

"اپنا کرتا پھاڑ ڈالیں گے پچھاڑیں کھائینگے
جائینگے ہم جائینگے، ہم اس گلی میں جائینگے"

عیبِ طفلانہ کچھ ایسا بدنما ہوتا نہیں
کوئی بچّوں کی شرارت پر خفا ہوتا نہیں
ہاں مگر اس کا یقیں کر لے جو کچھ کہتا ہوں میں
دیر تک تجھ سے کبھی غافل نہیں رہتا ہوں میں
اب بھی تاباں ہیں مرے سینے میں تیرا آفتاب
اب بھی دل میں بج رہا ہے دورِ ماضی کا رباب
سینۂ ارض و سما کا وہ تلاطم یاد ہے
وہ تکلّم، وہ ترنّم، وہ تبسّم یاد ہے
اب بھی میرے سر پر اک بدلی سی ہے چھائی ہوئی
خون میں شادی کی شہنائی ہے لہرائی ہوئی

آج بھی جوئے طرب کی وہ روانی یاد ہے
آرسی مصحف کی وہ انجم فشانی یاد ہے

ڈوب ہی سکتا نہیں تا عمر جس کا آفتاب
نبزرے رخساروں کے پردے میں ہے وہ صبحِ شباب

عطر اور ابٹن سے نہا جو کل چمن اندر چمن
اب بھی نظروں میں ہے تیرا وہ عروسی بانکپن

یادِ ماضی سے جو رخ پر ہے عرق اسکو نہ کوس
یہ تو ہے آغاز کی بھیگی ہوئی راتوں کی اوس

آج تک ہر جلوہ میرے دل کے آئینے میں ہے
کل تھی جو بالوں پر افشاں آج وہ سینے میں ہے

میرے سینے میں وہ افشاں اب خرام گنگ ہے
جس میں تاروں کی چمک قوسِ قزح کا رنگ ہے

آئینے کے سامنے کھلتی ہیں جب زلفیں تری
اپنے سہرے کی مہک آتی ہے مجکو آج بھی

کیوں ہے لٹ کی اس سفیدی سے ترے دل میں کسک
یہ تو ہے دھندلے سہانے خطِ ابیض کی جھلک

ایک مبہم سی سفیدی سے نہ ہو یوں بدگماں
یہ تو گزری چاندنی راتوں کی ہیں پرچھائیاں

راست گوئی ہے مرا ایماں کہ افغاں زادہ ہوں
کل تھا جیسا آج بھی ویسا ترا دلدادہ ہوں

لیلائے آزادی سے

نومبر ۱۹۴۵ء

گوش بر آواز ہیں نو واردانِ انجمن!
زحمتِ یک حرفِ تازہ اے بتِ شیریں سخن
زندگی کو صبح دے اے مشعلِ یزداں نما
ایک مدت سے شب افشاں ہے زمیں پر اَہرمن
کاکل و مژگاں کو برہم کر کے دُنیا کو بتا
یہ کہ یہ ہستی ہے یہ مبہم دعوتِ دار و رسن

جس سے شاخیں جھومنے لگتی ہیں کھل جاتے ہیں پھول

پھر وہی موجِ سخن اے چشمۂ طرفِ چمن

زیست کی آہ و فغاں سے پھر ہے کانوں میں خراش

مسکرا کر پھر اٹھا لے بربط اے گل پیرہن

ناز سے اٹھلا رہے ہیں ہر روِش پر زشت رو

کس طرف ہے اے بتِ بستاں جبین و سیم تن

باغ پر چھائے ہوئے ہیں خادمانِ خار و خس

اب تو ور آ باغ میں اے خسروِ سروِ چمن

اس طرف بھی اک نظر اے مہرِ بزمِ صبح گاہ

مدتوں سے تیرگیِ شب ہے صدرِ انجمن

ہو چکا دورِ صبوحی، ساقئ رنگیں مزاج
ہات میں تلوار دے کر، دوش پر رکھ دے کفن
اِذنِ تبلیغِ محبت دے نگاہِ ناز کو
گامزن ہیں جادۂ نفرت پہ شیخ و برہمن
زندگی و سربلندی کا دلوں کو درس دے
اے بہ لب آبِ حیات و اے بہ قد سروِ چمن
ترک فرما یہ خموشی، چاک کر دے یہ نقاب
اے لبِ ساقی شکار و اے رخِ مینا شکن
دستخط کر دے جدید آئین کے فرمان پر
یہ ہے قرطاس و قلم، اے ناسخِ شرعِ کہن

ٹوٹ جائے سبحہ و زنّار کا بندِ گراں
کھول دے ہاں دوش پر زلفِ شکن اندر شکن
قدر فرما جوشؔ کی لیلائے آزادیٔ ہند
یہ گدائے راہ ہے سلطانِ اقلیمِ سخن

ایک جانِ بہار کی نذر میں

جولائی ۱۹۴۱ء

اے بہ رُخ مصحفِ گلزار ابد چراغِ حرمِ غنچگی و آیۂ گُل باری و قرآنِ بہار

اے بہ قد موجِ رواں، رُو نیتاں، سروِ سہی، شاخِ گُلِ تازہ و الہامِ خرامانِ بہار

بہ گُلِ کسب در اس قدِ بالائے فلک تاب چمن ساز کو دے اذنِ خرام

کہ ترے ہجر میں بے کیف ہے، بے روح ہے، بے تاب ہے، بے آب ہے لیلائے جہانِ بہار

نرم کی بزم ہے پژمردہ و افسردہ و دل بستہ و خاموش و ملول و غمناک

کھول دے کاکلِ ژولیدہ و سرمست کہ تا جہاں صید گہِ سر کہ بہ چشمۂ حیوانِ بہار

آبھی جنبش میں کہ ہیں گوش بر آوازِ بیانِ حریفانِ گل و لالہ و سرو

اے لبِ لعلِ فسوں بار و دل آویز و شکر ریز کہ ہے تجھ پہ فدا لرزشِ دامانِ بہار

بربط و عود و شراب و دف و افسانہ و افسونِ شبِ ماہ و رباب و ساغر

ہاں کہ مشتاق ہیں اے جانِ چمن، زہرہ جبیں، ہوش ربا، ماہ لقا، شمعِ شبستانِ بہار

دہر ہے خفتہ و آشفتہ و آزردہ و غم دیدہ و ناشاد و زبوں حال و تباہ

ہاں اٹھا نرگسِ مخمور و گہر تاب و جنوں خیز کہ ہے محبسِ میخانہ و زندانِ بہار

آج ہے حافظِ شیرازی و خیام و نظیری و فغانی و ظہوری کا جواب

یہ ترا جوش کہ ہے مستِ خراباتی و سر حلقۂ رندانِ جہاں، قبلۂ خاصانِ بہار

مستقبلِ ہندوستان

اپریل سنہ ۱۹۳۶ء

کچھ ایسا آج گردوں کا سماں معلوم ہوتا ہے
کہ عکسِ آتشِ رطلِ گراں معلوم ہوتا ہے
یہ جنبش کس کے لعلِ شکریں کو ہے کہ سنّاٹا
نشیدِ شاعرِ جادو بیاں معلوم ہوتا ہے
یہ کس نے چونک کر انگڑائی لی ہے آسمانوں پر
زمیں کا ذرّہ ذرّہ پرفشاں معلوم ہوتا ہے

اُٹھایا ہے یہ کس نے جھٹ پٹے کا طرفہ آئینہ
تبسم کاروانِ در کارواں معلوم ہوتا ہے
یہ جوڑا کس نے باندھا ہے نشیلی انکھڑیاں مل کر
فضا میں وا درِ پیرِ مغاں معلوم ہوتا ہے
یہ کس کے قشقۂ رنگیں کا پرتو ہے کہ ہر ذرّہ
چراغِ محفلِ روحانیاں معلوم ہوتا ہے
جھپکتی ہیں یہ کس کی مدبھری آنکھیں ستاروں میں
جہاں مستِ شرابِ ارغواں معلوم ہوتا ہے
یہ کس کمسن نے باہیں ڈال دی ہیں گرم جوشی سے
جہاں باوصفِ پیری نوجواں معلوم ہوتا ہے

یہ کس کے روئے ناشستہ کا ہے رنگِ تنک تابی
اُفق پر اِک سنہرا سا دھواں معلوم ہوتا ہے
نئیں جنبش میں ہیں بادِ صبا یہ کس کے ماتھے پر
یقیں کی شمع پر دُودِ گماں معلوم ہوتا ہے
یہ افشاں کس نے چھڑکی ہے طلسمی شبنستاں میں
کہ ہر خوشہ، جواہر کی دکاں معلوم ہوتا ہے
ترانے ہیں یہ کس دنیا کے مبہم آبشاروں کے
تخیّل موجۂ آبِ رواں معلوم ہوتا ہے
صبا یہ کس کی زلفِ خم بہ خم کو چھیڑ آئی ہے
زمانہ داستانِ درد استاں معلوم ہوتا ہے

ہوا نے یہ اُڑایا ہے ہرا کس کی ولائی کا
کہ عالم اک فسونِ کہکشاں معلوم ہوتا ہے
یہ زریں غُرفۂ مشرق سے مُکھڑا کس کا دمکا ہے
دُھندلکا موجِ رنگِ پرنیاں معلوم ہوتا ہے
یہ کس نے بربطِ زرّیں اُٹھایا ہے کہ اک عالم
غزلخواں، گل چکاں، گوہر فشاں معلوم ہوتا ہے
خراماں یہ ہوا ہے کون شوخ و شنگ بستاں میں
چمن رقصاں، رواں، جُنباں، دواں معلوم ہوتا ہے
بحمداللہ کہ جوشِ اس صبحِ نَو کی تازہ کاری میں
مجھے مُستقبلِ ہندوستاں معلوم ہوتا ہے

پیری و حرص

دسمبر ۱۹۳۵ء

ڈھال پر آئی جو عمرِ زر پرست
دل میں گونجا اور دیوِ حرص و آز
جیسے میدانوں میں ہنگامِ غروب
تار کے کھمبوں کے سائے ہوں دراز

شیریں کلامی

دسمبر ۱۹۴۵ء

مُسکرا کر اُس نے کی جیسے ہی بات
ہونٹ پر چٹکائی بیلے کی کلی
اور زباں نے یوں چھوا اندر سے گال
مُنہ میں گھومے جیسے مِصری کی ڈلی

روشن خرامی

فروری ۱۹۳۶ء

منہ اندھیرے جب گزرتی ہے وہ صحنِ باغ سے
لالہ و نسریں پہ یوں ہوتی ہے رقصاں روشنی
ریل گاڑی کے گزرتے وقت جیسے رات کو
دوسری ہمسایہ پٹڑی کی گریزاں روشنی

خود بینی

مارچ ۱۹۴۶ء

ریل کے تابندہ درجے میں پئے لطفِ سفر
رات کو کھڑکی کے شیشے پر جمائی جب نظر
دیکھتا کیا ہوں زمیں گردوں، فضا کچھ بھی نہیں
اپنے درجے، اپنے چہرے کے سوا کچھ بھی نہیں
دیکھ کر یہ رنگ روشن ہو گئی تاریک رات
کھُل گئے مجھ پر یکایک فرقِ خود بینی کی بات

اُس کے آگے بھی زمین گردوں فضا، کچھ بھی نہیں
اپنی ہستی، اپنی مستی کے سوا، کچھ بھی نہیں

نقش و عکس

اپریل سنہ ۱۹۴۶ء

ایک نقشِ دل رُبا اِک عمر سے تھا دل نشیں
دل پہ کانپا یک بیک اک دُوسرا عکسِ مُبیں
دل میں نقش و عکس کا اک فتنہ پیدا ہو گیا
نقش چھپٹا، عکس لپکا، حشر برپا ہو گیا
آب و تابِ نقشِ پیشیں نے جگائی خُفتہ ضَو
اور شبابِ عکسِ نَو وارد سے برسا رنگِ نَو

نقش نے ماضی کو دی آواز، تارے ہِل گئے
عکس کو کچھ حال یوں آیا کہ غنچے کِھل گئے

کُہنہ لمحے حافظے میں سسکیاں لینے لگے
تازہ جذبے اِس طرح بھڑکے کہ لَو دینے لگے

نقش نے اپنی جڑیں مقدُور بھر، مضبوط کیں
عکس نے جتنی جڑیں تھیں نقش کی، سب کھینچ لیں

عکس روشن تر ہُوا، اور نقش دُھندلا ہو چلا
عکس اُبھر کر اور جاگا، نقش دب کر سو چلا

عکس نے بڑھ بڑھ کے یوں بیداد پر بیداد کی
نقش نے پچھلے قدم ہٹتے ہوئے فریاد کی
جاتے جاتے نقش آخر بات اک ایسی کہہ گیا
دل پہ بجلی گر پڑی، میں سر پکڑ کر رہ گیا

زندگی اور ریل

اِس جہاں کے حملۂ گرم و سرد و زِشت و خُوب سے
زندگی جاتی ہے یُوں ہر موڑ پر بچتی ہُوئی
ڈاک گاڑی کے گزرتے وقت جیسے پے بہ پے
مختصر اسٹیشنوں کی قینچیاں بجتی ہوئی

آں کہ من دانم

رَواں بخشِ دو عالم یک ادائے آں کہ من دانم
متاعِ گیتیٔ دگر دوں فدائے آں کہ من دانم
خُداکی آرزوئے بندگی سکتے میں آجائے
اگر دیکھے مرے سجدے پہ پائے آں کہ من دانم
شُعاعِ چہرۂ گُل گُون و ابرِ برقعِ شب گوں
مکمّل اِک فسُونِ صبح و مسائے آں کہ من دانم

تصوّرِ اہرمن کا اڑ گیا دل سے دُھواں بن کر،
بہ تابِ جلوۂ یزداں نمائے آں کہ من دانم

غرورِ سروِ بُستانیؔ و نازِ شاخِ مَرجانی
نثارِ قامتِ زریں قبائے آں کہ من دانم

نہیں موجُود ہے واللہ کوئی پیکرِ خُوبی
بہ زیرِ گنبدِ گردوں سوائے آں کہ من دانم

طلُوعِ صبح کی رنگینیاں قربان ہوتی ہیں
زہے گُل تابی نکہت سرائے آں کہ من دانم

مری ہر سانس چٹکاتی ہے کلیاں رازِ ہستی کی
بہ فیضِ گیسوئے عقدہ کشائے آں کہ من دانم

بہارستانِ صوتِ سرمدی میں صبح ہوتی ہے
بہ لحنِ بلبلِ شیریں نوائے آں کہ من دانم

نظامِ ثابت و سیّارہ ہم آہنگ ہوتا ہے
ز آوازِ لطیفِ دل رُبائے آں کہ من دانم

جسے اہلِ نظر جوشِ ملیح آبادی کہتے ہیں
وہ سُلطانِ معانی ہے گدائے آں کہ من دانم

غیبت

(۱)

زر کا پروانہ ہے، عزّت کا طلبگار بھی ہے
جوشؔ صاحب وہ منافق بھی ہے عیّار بھی ہے
اُس کی آنکھوں میں ذہانت کا دِیا جلتا ہے
اُس کی آواز کے سائے میں فسوں چلتا ہے
وہ طبائع کے ہر اک باغ سے پھل لیتا ہے
جیسا موقع ہو وہ آواز بدل لیتا ہے

رہتی ہے مونچھیں منڈائے ہوئے اکثر آواز
اور لفظوں میں لٹکتی ہے کبھی ریش دراز
گاہ فقروں کو بنا دیتا ہے بالکل گوپی
کبھی تقریر کو پہنا دیتا ہے ترکی ٹوپی
کبھی گفتار کو دیتا ہے جڑاؤ گہنے
نطق ہوتا ہے کبھی چھینٹ کی بنڈی پہنے
غرضِ مطلب کے کبھی بال بڑھا دیتا ہے
سر کبھی حرفِ تمنّا کا گھٹا دیتا ہے
دھوکا دے سکتا ہے کیا پینترے میں پاؤں اُسے
وہ پہلوان ہے، آتا ہے ہر اِک داؤں اُسے

اُس کی اِملاک میں ہر نوع کی عیّاری ہے
رُخ پہ ہے زُہد کبھی اور کبھی سرشاری ہے

پڑتی رہتی ہے ہر اک لفظ پہ بول عقل کی جھوٹ
سچّے گوٹے میں لپیٹے ہوئے رہتا ہے وہ جھوٹ

رُخ پہ اخلاص کا رکھتا ہے وہ رنگِ اظہار
جس طرح بُت کے تصوّر سے برہمن سرشار

قرض اِس ناز سے لینا ہے یگانہ بن کر
چہرہ کہتا ہے کہ احساں یہ کیا ہے تجھ پر

"پاک" آنکھوں سے نکلتی ہے "صداقت" کی کرن
رُخ کی سُرخی میں پھبکتا ہے محبّت کا چمن

"کوئی بھاگے تو وہ پلکوں سے پکڑ لیتا ہے
ہنس کے انفاس کے تاگے میں جکڑ لیتا ہے

"کھول دیتا ہے درِ قصرِ شکر خند کبھی
قبۂ اشک میں کرتا ہے نظر بند کبھی"

"لفظِ دعوت کے لئے کان کھڑے رہتے ہیں
گہری آنکھوں میں سبک جال پڑے رہتے ہیں"

"جھوٹا افلاس دکھانے کو وہ لب چاٹتا ہے
اہلِ نعمت کی نگاہوں سے گرہ کاٹتا ہے"

"زر و پازیب کی جھنکار کا متوالا ہے
اُس نے جس گھر کو بھی تاکا ہے اُسے گھالا ہے"

"دیکھنا ہے سوئے افلاک قسم کھا کھا کر
دام پر اُس کے پڑی رہتی ہے نیلی چادر"
"چشمِ بیدار سے نظروں کو اڑا لیتا ہے
کاجل ابلیس کی آنکھوں سے چرا لیتا ہے"
"آگ کو چوم کے وہ برف بنا دیتا ہے
آہ کو دے کے گرہ حرف بنا دیتا ہے"
"کڑکڑاہٹ سی لئے چور ہنسی میں گویا
تیز مقراض سے کٹتے ہوئے ریشم کی صدا"
"چہرۂ اخلاص کی وادی میں گہر کی بارش
لہجۂ مُقتّیش کے لچھّوں کی ہوا میں جنبش"

(۳)

کہہ چکے آپ؟ اجازت ہو تو کچھ عرض کروں
یعنی اِس بات کو میں سچ بھی اگر فرض کروں
یہ وہ سچ ہے، جو سُنے، دشمنِ انساں ہو جائے
جھُوٹ بھی اِس کو جو دیکھے تو پشیماں ہو جائے
آپ نے جن کا ابھی ذکر کیا بندہ نواز
واقفیّت نہیں مجکو وہ کبوتر ہیں کہ باز
مجکو معلُوم نہیں پاک ہیں وہ یا زِندیق
ہاں مگر آپ کے بارے میں ہوئی یہ تصدیق

کہ کوئی آپ کا ہمسر نہیں چشمِ بد دور
فنِ غیبت کے ہیں اس وقت شہنشاہ حضور
لاش ہم جنس پہ ہنس ہنس کے قدم رکھتے ہیں
بھائی کا گوشت رفیقوں کا لہو چکھتے ہیں
سوچتا ہوں کہ جو غیبت سے ہوا یوں رنجور
ہو نہ ہو مجھ میں بھی ہے کوئی بڑا عیب ضرور
ورنہ آپ آتے نہ یوں وقت گنوانے کے لئے
چھانٹتے مجھ کو نہ غیبت کے سنانے کے لئے

~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~

تثلیثی فریب

چھری دبائے ہوئے ہیں بغل میں اہلِ مشن[1]
شفیق بن کے مگر مسکرائے جاتے ہیں

فقیرِ برہنہ[2] سے ہو رہا ہے راز و نیاز
جناح[3] اور جواہر[4] منائے جاتے ہیں

وہ "فتنہ ساز" جو کل تک تھے جیل کی خوراک
وہ آج جیل کے درباں بنائے جاتے ہیں

---

[1] برٹش کیبنٹ یعنی وہ اصحابِ ثلاثہ جو ہندوستان کو آزادی کا پروانہ دینے کی خاطر اس سرزمین پر نازل ہوئے ہیں
[2] گاندھی جی [3] محمد علی جناح [4] جواہر لال نہرو۔

جو سر کبھی نہ جھکے تھے جلالِ شاہی سے
حضورِ حضرتِ ویول[1] جھکائے جاتے ہیں

وہ والیانِ ریاست جو ننگ عالم ہیں
نظر بچا کے گلے سے لگائے جاتے ہیں

سرِ نیاز کو سہلا رہے ہیں ناز کے ساتھ
مگر غریب کے بھیجے کو کھائے جاتے ہیں

پڑی ہوئی ہے جہاں خار و خس پہ چادرِ گل
وہ سبز باغ ہمیں پھر دکھائے جاتے ہیں

سرِ حباب پہ چپکے سے رکھ کے کوہِ گراں
گلہ سے کاہ کے ریشے ہٹائے جاتے ہیں

[1] لارڈ ویول وائسرائے ہند

بہت بڑے ہیں "خدا" کے وکیل گاندھی جی
مگر فریب میں شیطاں کے آئے جاتے ہیں
بجا رہے ہیں بلندی پہ ساز آزادی
"وٹو" کی ہانک بھی لیکن لگائے جاتے ہیں
ہر ایک لٹ میں پٹی جا رہی ہیں زنجیریں
نئے اصول سے گیسو بنائے جاتے ہیں
مدبران کہن سال کو پئے ترغیب
طرح طرح کے کھلونے دکھائے جاتے ہیں
دیارِ ہند میں گوروں کی فوج کے ہوتے
سریرِ امن پہ کالے بٹھائے جاتے ہیں

سروں پہ لطف کے برسائے جا رہے ہیں پھول
دِلوں پہ مہر کے سِکّے بٹھائے جاتے ہیں
زباں پہ جن کی لگائے گئے تھے قُفل کبھی
فسانہ کہنے کی خاطر بُلائے جاتے ہیں
خُدا کی شان جو باغی عدوئے سلطاں تھے
وزیر نائبِ سلطاں بنائے جاتے ہیں
اگرچہ پہلوئے ذم ہے مگر بقول جگر[1]
”ہم اُن میں، اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں“

[1] جگر مرادآبادی

رُباعیات

سنہ ۴۵-۱۹۴۶ء

اے طالبِ امرِ خَیر و جویائے نجات

سُن غور سے اربابِ نظر کے کلمات

پیشِ وابستگانِ زلفِ حکمت

جُھک جا کہ یہ ہیں عُقدہ کُشایانِ حیات

(ا)

امیرِ فکر و تخیّل نٹشے اعظم کے نام

اللہ یہ تیرگی، یہ دہشت، یہ غُبار
کس حد کا عمیق اور پُرہَول ہے غار
اس غار میں یہ کون ہے اُفتاں خیزاں
"رُوحِ نوعِ بشر ہوں، اسے جوشِ اُبھار

اِنساں ہے آج تک جہُول اور ظلوم
حکمت، نہ ذہانت، نہ بصیرت، نہ علُوم
افسوس کہ کینچلی میں لپٹے ہُوئے ذہن
اب تک ہیں نسیمِ آگہی سے محروم

قرنوں کا لہو چوس کے باقی ہے یہ جان

مچھلی سے بنے ہو مدّتوں میں اِنسان

لیکن اِس اوج و منزلت کے باوصف

باقی ابھی تم میں ہے بہت کچھ حیوان

قرنوں ابھی ٹوٹیں گے ہزاروں تارے

سر سے ابھی گزریں گے کروڑوں دھارے

اِنساں بننے میں ہے ابھی وقت بہت

ابتک تو فقط دُم ہی جھڑی ہے پیارے

"بحر و بر و باد کے سلیماں ہم ہیں"
"آہن بکف و برق بداماں ہم ہیں"
افسوس کہ اتنے ہی پہ خوش ہیں احباب
دنیا کے اہم تریں حیواں ہم ہیں

جینا ہے تو جینے کی محبت میں مرو
غارِ ہستی کو نیست ہو ہو کے بھرو
نوعِ انساں کا درد اگر ہے دل میں
اپنے سے بلند تر کی تخلیق کرو

ہاں زلفِ حیات آج تک ہے برہم
ہر گام پہ ہے جادۂ تہذیب میں خم
اِس دہر میں آچکے ہیں آدم کتنے
اِس دہر کی راہ میں ہیں کتنے آدم

کانٹوں سے پٹا پڑا ہے بُستاں اب تک
خود درد میں مبتلا ہے درماں اب تک
کشتی میں چھپا ہوا ہے سیلاب ہنوز
انساں میں ہُمک رہا ہے حیواں اب تک

اب تک نایاب ہے حقائق کی بیاض

اِغماض، اے علم، اور اتنا اغماض

قرنوں کے مجاہداتِ افکار کے بعد

اِنساں آیا ہے "تا خواص و اعراض"

مجکو تو بہت پسند ہے یہ طوفان

دولت ہے بڑی بشر میں شر کا میلان

عالم کو مسخّر نہ کبھی کر سکتا!

اِتنا پاجی اگر نہ ہوتا اِنسان

نکہت کا ہے ہر جزاِن صالحؔ جاسوس
بے شرِ انسان ہے خُروس و طاؤس
یہ حرف شریروں کی شرارت ہے کہ جو
ہونے نہیں دیتی مجکو اُن سے مایوس

تعلیم سے بنتا نہیں عالم انساں
جب تک سوئے آگہی نہ دل ہو نگراں
جب جہل ہو عینِ ذات و عینِ فطرت
دستارِ فضیلت ہے فقط بار گراں

بدنفس و غبی ہے ایک قدرت کا ستم
آزردگی نکتہ شناسی کی قسم
سر میں آتی ہے بات ٹیڑھی ہو کر
فطرت میں اگر کجی ہے، اور ذہن میں خم

اللہ رے ایمانِ "خداداد" کا جہل
ہر صید میں پرفشاں ہے صیّاد کا جہل
اخلاف کے علم پر ابھی تک صد حیف
لرزندہ ہے مثلِ دود اجداد کا جہل

حیراں ہے جو خود، کیوں اُسے حیران کرو
ہلکان کو، ہاں، اور نہ ہلکان کرو
اے اہلِ حرم، رُوحِ بشر کو للہ
اقوال و عقائد پہ نہ قربان کرو

قُدسی سے یہ بہتر تھا کہ انساں ہوتا
دانا سے یہ اولیٰ تھا کہ ناداں ہوتا
دیوانۂ بُوئے زلفِ ایماں اے کاش
پروانۂ روئے خُوب رُویاں ہوتا

کیا قہر ہے رُوئے بَد پہ شیدا ہونا
ذلّت کے مقام پر ہویدا ہونا
اِنساں کی زبُوں تریں بدبختی ہے
بد اصل و دَنی قوم میں پیدا ہونا

انسان کی زینت ہے تمدّن کا بناؤ
قُدرت کا یہ غیر مشفقانہ برتاؤ
بڑھ جاتی ہے ناخُدا کی ہمّت دہ چند
جس وقت کہ طوفان سے ٹکراتی ہے ناؤ

اِنساں کی تباہیوں سے کیوں ہے دلگیر
کاکل میں بدل جائے گی کل یہ زنجیر
اِس آدمِ فرسودہ کے زیرِ تخریب
اِک آدمِ نو کی ہو رہی ہے تعمیر

کوئی ہے نہ اہرمن، نہ کوئی یزداں
اوّل اِنساں ہے اور آخر اِنساں
آدم کا دماغ ہے وہ کشتی عظیم
ہونے پہ ہے غرقِ ناخدایانِ جہاں

دانستہ نہیں کرتا اِنسان خطا
رہتی ہے حضورِ عقل بے جان خطا
ترغیبِ خطا مگر جب آتی ہے قریب
ہو جاتے ہیں اِنسان کے اوسان خطا

یہ وقت نہیں وقتِ خروشِ طوفاں
یہ وقت متاعِ دل ہے سرمایہ جاں
اِنساں رواں ہوا ہے اپنی جانب
چُپ ہو اے اہرمن خموش اے یزداں

یاں لاکھوں ہی بلبلے اُبھر جاتے ہیں
ذہن دریا کو گندا کر جاتے ہیں
کتنے ہیں کہ اپنی زندگی کے حق کو
ثابت نہیں کرتے اور مر جاتے ہیں

دامن پہ دنا رت کا اگر داغ نہیں
کیا فکر اگر چھوٹ گیا جیل میں
واللہ کہ انساں کے عمل کی زشتی
بہتر ہے خیالات کی پستی سے کہیں

وہ گرد ہے، سب اَٹے ہوئے ہیں معبود
سب ایک سبق رَٹے ہوئے ہیں معبود
ہاں دیکھ کہ اِس خیمۂ زنگاری میں
کتنے احمق ڈٹے ہوئے ہیں معبود

ہر عقل کی بات پر بگڑ جاتے ہیں
غراتے ہیں، اینٹھتے ہیں، بل کھاتے ہیں
زنبیل میں جہل رکھ چکا ہے جن کو
وہ علم کی جھولی میں کہیں آتے ہیں

پارینہ روایات کے پھیلائے ہوئے
وہموں کے گلوں میں طوق لٹکائے ہوئے
اُن سے اور اُمیدِ عقل، توبہ، توبہ
جو لوگ ہیں احمقوں کے بہکائے ہوئے

رگ ذہن کی موج آ کے چڑھ جاتی ہے،
موج آ کے زبوں فسانے گڑھ جاتی ہے،
افسوس کہ داناؤں کی باتیں سُن کر
ناداں کی حماقت اور بڑھ جاتی ہے

مسجد کی طرف رواں ہیں اہلِ منبر
کُندے کھولے ہوئے، جھکائے ہوئے سر
اُن گاڑیوں کی طرح چرا چر کرتے
جن میں کہ مَنوں بھَرے ہوئے ہیں پتھّر

محراب میں چند حرف وہ بھی اک پَل
منبر پہ خروش مثلِ سگہائے جمل
اعمال میں خیر صرف اِک آدھی مُٹھّی
اقوال میں شر بقدرِ صد دشت و جبَل

نیچوں کے مکانوں پہ ہے اونچا جھنڈا
ایمان بنا ہوا ہے گندا انڈا
ہر شخص کے ہات میں ہے آج اُس کا خدا
ہمسائے کا سر پھاڑنے والا ڈنڈا

اک دل میں نہیں نام کو حُبِّ مقصود
حاسد ہے کوئی خیر سے، کوئی محسود
اپنے ہی مقاصد کی حدوں میں جکڑے
یارانِ مجاہد کا "انا" ہے محدود

اِک کاوشِ بے درد کہ ہے نذر و نیاز

اِک گرمیٔ عاجزانہ ہے سوز و گداز

جو خوف کے ڈر سے ہوا ہے پیدا

مُلّا کہتا ہے اُس تشنّج کو نماز

یہ پیر ہے، پیرِ مُردہ چشم و ابرو

چلتا نہیں اِس پہ زِندگی کا جادو

آنکھوں میں دبی ہوئی ہے ٹوٹی ہوئی قبر

اور سانس سے آ رہی ہے کافور کی بُو

یکبارگی ہر موج سے ذِلّت اُبھری
اِنسان کی تہ نشیں ضَلالت اُبھری
ماری گنگا میں جب کہ پنڈت نے چھلانگ
تو سطح پر اِک بڑی حماقت اُبھری

مسجد میں جب اِستادہ نظر آتے ہیں
سب بھیک پر آمادہ نظر آتے ہیں
تحسین ہی کے حرف نہیں یہ طالب
اُجرت کے بھی دلدادہ نظر آتے ہیں

ایماں، اِخلاص، آدمیّت، ایثار
مقصود ان الفاظ سے ہے اب بیوپار
اِس طرح مُنافقوں نے رَوندا ہے اِنہیں
ہر لفظِ نِکو ہے خُودکشی پر طیّار

ناپُختہ و بے سواد پا کر تجھ کو
قہّار کے ہَوّے سے ڈرا کر تجھ کو
حکمت کا بنا دیا ہے جانی دشمن
پیرانِ شُبک نے وَرغلا کر تجھ کو

ہوتی نہیں جس کے ذہن میں نکہتِ گُل
بن جاتی ہے زاغ، اُسکے چمن کی بُلبل
ہوتی ہے جہاں زمین شور و سنگیں
اُگتا ہے ببول بن کے تخمِ سُنبل

غصب و غیبت کے مشغلے ہیں دن رات
ایمان کو دے چکے ہیں سو مرتبہ مات
وہ جام اُٹھانے سے خفا ہوتے ہیں
جو لوگ اُٹھا چکے ہیں اللہ پہ ہات

اے بھائی اِس اِتّقا کے بخیے کو اُدھیڑ
بے فائدہ کیوں اُٹھا رہا ہے یہ کھکھیڑ
ہشیار کہ حوران بہشتی کے عوض
ہو گی فردوس میں خدا سے مڈبھیڑ

اے خواب نما یہی ہے باغِ رضواں
حوروں کا کہیں پتا، نہ غلماں کا نشاں
اِک کنج میں خاموش و ملول و تنہا
بیچارے ٹہل رہے ہیں اللہ میاں

یہ ذرخ یہ عبادت کا بھیانک پندار

یہ ریش، یہ عمامہ، یہ ڈھیلی شلوار

اپنی اک سال کی کمائی دیدوں

یہ رنگ جی کی نقل پر اگر ہو تیار

مسجد میں بہشت کی ہوا آجائے

اُجلی گڈوں کے چہروں پہ ضیا آجائے

منبر پہ جو پھڑکا رہا ہے داڑھی

یہ دیو جو ناچے تو مزا آجائے

ریچھ

باچھیں یہ پھٹی ہوئی، دہن کا یہ غار
اُبھرے ہوئے یہ دراز دانتوں کی قطار
اور اُس پہ یہ مکرُوہ ہنسی کا انداز
گھوڑا جیسے ہے کاٹنے پر تیّار

تیری صورت ہے دل کی اب تک تمّام
تو کذب کے نشاں نہیں اے کاذبِ خام
کہتے ہیں اُسے پختہ دروغ و فن کار
جس کا چہرہ الف نہ ہو وقتِ کلام

پھنکار ہے اُس سر کہ جبیں کی ہر سانس
آنکھیں ملتے ہی دل میں چبھ جاتی پھانس
جب اُس کی گلی سے بھی گزرتا ہوں کبھی
آتی ہے مری ناک میں مرچوں کی سی دھانس

مُلّاؤں کے ہے وردِ زباں لفظِ لعیں
ہوتے ہیں ذرا سی بات میں چیں بہ جبیں
اُڑتا ہے غبارِ شب مچاؤ جو انہیں
بالو کی یہ بوریاں ہیں، انساں نہیں

موضوعِ سخن بجر کی تھی گہرائی
یہ وہم نے کس شخص کے لی انگڑائی
چھیڑا یہ کس نے ذکرِ چاہِ زمزم
مینڈک کی یہ آواز کہاں سے آئی

اِک عمر تصوّف نے مجھے چکرایا
اِس بجر میں ایک بھی نہ موتی پایا
ہر مرتبہ جب کہ جال کھینچا میں نے
تو ایک نہ اِک وہم اٹک کر آیا

پیروں میں مذمتِ سبو ہوتی ہے
بوئے صہبا بہ گفتگو ہوتی ہے
کون اُن سے کہے کہ کھاؤ ذہن کی مے
اور کھاد میں ظاہر ہے کہ بو ہوتی ہے

تیرے نر میں چھپی ہوئی ہے مادا
باطن پیچیدہ، اور ظاہر سادا
شیطان کے بچے دیکھتے ہی تجھکو
چلاتے ہیں ایک دم سے "دادا دادا"

دل! اور کمانِ حق کڑکوا مجھ سے
نافر ہے ہر اِک سفیہ بھکوا مجھ سے
کافر کہتا ہے ہر مُکوڑا مجھ کو
چُوں چُوں کرتا ہے ہر چرکوا مجھ سے

کل عقل کے گُر جو ایک ناداں کو بتائے
بیٹھا رہا وہ دیر تک گردن کو جھکائے
جھانکی آنکھوں سے اُس کی جھینپی ہوئی رُوح
چھوٹا سا حقیر چہرہ داڑھی میں چھپائے

کھاتی ہوئی اِک کھڑنک روٹی نکلی
جیسا تھا گماں ویسی ہی موٹی نکلی
اِک عقل سے ملنے جو کہا "سر سے نکل"
باندھے ہوئے چھوٹی سی لنگوٹی نکلی

ہوتی ہے عیاں ذہن پہ قیمت اپنی
آتی ہے نظر صاف حماقت اپنی
ہوتا ہے وہ کِس درجہ چکا چوند کا وقت
جب علم پہ کھُلتی ہے جہالت اپنی

تیرا چہرہ ہے میری نظروں کا عذاب
آنکھیں تری ڈائن ہیں تو دنداں قصاب
للہ مرے سامنے یوں جم کے نہ بیٹھ
ڈرتا ہوں کہ ایمان نہ ہو جائے خراب

~~~~~~~~

کرتے نہیں تازہ زندگی سے اِنصاف
رہتے ہیں ہمیشہ عصرِ حاضر کے خلاف
ماضی کے قصیدہ خواں قدامت کے مرید
کرتے رہتے ہیں صرف لاشوں کا طواف
~~~~~~~~

~~زہّاد ہیں مُرتشی خدا راشی ہے~~

ترکِ لذّت کی تہ میں اوباشی ہے

یہ صوم و صلوٰۃ و حجّ و خیرات و زکوٰۃ

واللہ کہ طیّاری و عیّاشی ہے

محمود ہے ہاؤ ہوئے عشق و ایماں

مذموم ہے دار و بستِ عقل و برہاں

کب دیکھیں ملے یقین کو یہ منصب

اب تک تو گماں ہے الٰہِ دوراں

اے مردِ خُدا نفس کو اپنے پہچان
اِنسان یقین ہے، اور اللہ گماں
میری بیعت کے واسطے ہات بڑھا
پڑھ کلمہ لا اِلٰہَ الا انسان

مخلوق کی خدمت سے بہت ڈرتا ہے
اپنے ہی لئے آٹھ پہر مرتا ہے
افسوس ترا انا تیّے جامد اے شخص
اپنے سے تجاوز ہی نہیں کرتا ہے

ہر گام پہ مِن مِنا رہے ہیں فرقے
ہر موڑ پہ بِھن بِھنا رہے ہیں فرقے
اُس مُلک میں لفظِ قوم کیونکر گونجے
جس مُلک میں ہِن ہنا رہے ہیں فرقے

مقصودِ رسالت ہے بشر کا اتمام
تا بندگیٔ خواص و بہبودِ عوام
اُمّت کو اگر مِل نہ سکا منصبِ حق
تو سمجھو کہ ہو گئی نبوّت ناکام

غنچے کا جمود ہے صبا کی توہین
پستی اُمم ہے انبیا کی توہین
ہر منکرِ کبریائی نوعِ بشر
کرتا ہے عزائم خدا کی توہین

تحقیق و تلاش سے عداوت ہے تمہیں
اوہام و روایات سے اُلفت ہے تمہیں
شرمندہ و رسوا و سُبک ہونے کی
اے اہلِ یقیں سخت ضرورت ہے تمہیں

کیونکر نہ چلے مزے سے ادیان کا کام
جب عقلِ خواص بھی ہو مانندِ عوام
مخلوق کو پھانستا ہے "یا حق" کہکر
مُلّا کا ہے چُوّ ہے دانہ اللہ کا نام

کرتے ہی نہیں معاف مشرک کا قصور؟
اور جذبۂ انتقام کا بھی ہے وفور؟
افکار کو جانتے ہیں کارِ ابلیس؟
اچھا، اِس مرتبے پہ فائز ہیں حضور!

اِک گرم سی بھاپ سر پہ مَنڈلاتی ہے
رگ رگ میں گرہ سی ایک بل کھاتی ہے
اُف عزمِ سفر کے فسخ ہونے کی گھُٹن
جذباتِ رواں کی سانس رُک جاتی ہے

اے بارِ خدا، جان چکا ہوں تجھ کو
جانا ہی نہیں، مان چکا ہوں تجھ کو
پھر کیوں ہے مرے فسخِ عزائم پہ مُصِر
کہتا ہوں کہ پہچان چکا ہوں تجھ کو

جو تحفۂ تلخی ہے وہ تریاق ہے سم
تو جس میں ہو، کس کام کی ایسی شبنم
موذی عرفاں سے جہل مطلق بہتر
سفّاکیِ فسّاخِ عزائم کی قسم

صورت پہ کروں نگہ تو انسانی
اور عقل کو دیکھو تو فقط حیوانی
یوں ہے پئے دیں گزیدہ حرفِ دانش
جیسے جسدِ مردہ کی جڑ میں پانی!

اے عابدِ سجدہ ریز، حق کو پہچان
ان تیری دعاؤں سے خطا ہیں اوسان
تا چند رہے گا تجھ پہ نادان طاری
دریوزہ گرِ اخلاق، گداگرِ ایمان

جب فکرِ رسا کے نصب ہوتے ہیں خیام
پڑ جاتا ہے اوہام کے گھر میں کہرام
اور عقل کی جیسے ہی سنکتی ہے نسیم
ہو جاتا ہے اقوالِ کہن کو سرسام

افسوس ہے اے نورِ خرد کے دشمن
بدبو سے بھرا ہوا ہے تیرا مسکن
کوزوں میں ترے بجھ رہا ہے اب تک
افسردۂ چادرِ روایاتِ کہن

~~~

اب جسم عقائد پہ نہیں وہ گہنے
اب کوئی مجاور نہیں باتیں پہنے
بیچارے پڑے پھرتے ہیں مارے مارے
ٹوٹے جوتے، پھٹی عبائیں پہنے
~~~

صد شکر کہ اے حریفِ افکار جدید
تجھ کو مجھ سے ہیں اختلافاتِ شدید
امروز اگر نواز دیتا مجھ کو
فردا سے نہ رہتی مجھے کوئی اُمید

"للّٰلہ ہمارے غُرفۂ دین کو نہ چھوپ"
"بل کھائیں گے مُجتہد بگڑ جائینگے پوپ"
یہ کہتی چلی آتی ہیں لاکھوں عقلیں
پہنے ہوئے آبار کے پُرانے کنٹوپ

اے شخص نہ کر اہانتِ عقلِ سلیم
کیوں محبسِ دیں میں ہے ترا ذہن مقیم
کیا تیری نجات کے بنیں گے ضامن
یہ بیہودہ عقائد اور یہ افکارِ سقیم؟

راہِ ایماں میں پیچ بے حد نکلے
ہر موڑ پہ سو شکستہ مرقد نکلے
جب دین کے شجرۂ نسب کو جانچا
تو حضرتِ خوف جدِّ امجد نکلے

جہاں کہیں جو دیکھ پائیں گے نمنہیں
اے اہلِ نظر بہت ستائیں گے تمہیں
ایمان گزیدگانِ اوہام پرست
ہٹ جاؤ نہیں تو کاٹ کھائینگے تمہیں

افسوس کہ حق کو آنکھ دکھلاتے ہیں
دانش کی کہو بات تو بَل کھاتے ہیں
یہ شپّرہ چشمانِ کلیسا و حرم
میں شمع جلاتا ہوں تو چلّاتے ہیں

کیوں ہے سحری کے وقت یہ چیخ پکار
خاموش ہو اے خُفتہ سرانِ بیدار
میکش ابھی چونکے ہیں صبوحی کے لئے
ہوجائیں نہ بھیرویں کی آنکھیں خُونبار

پیشِ اہلِ جلال و اربابِ جمال
خود فطرتِ انبیاء ہے بُنیادِ کمال
اور شیخ کے نزدیک ہے ہر ایک نبی
اللہ کا ڈاکیہ ازل کا دلّال

ہاں مسندِ بادہ پر امامانِ طرب
بر ناطقہ "یاصنم" بہ خاطر "یارب"
واں گنبدِ زہد میں فقیہانِ کرام
"بوجہل" بہ سینہ و "محمدؐ" برلب

تحقیق و تجسس نہ دلیل و برہان
پھر بھی مذہب پر مر رہے ہیں انسان
اب دین کی جھولی میں دھرا ہی کیا ہے
کچھ ضابطے، کچھ صحیفے، کچھ ایمان

اُس کی نظروں میں اور کھٹکتا ہے سبُو
جو ہے خُونی، حریص، غاصب، بدخُو
مینا پہ ہے مُنہ پُھلائے گویا وہ مشک
جس میں کہ بھرا ہُوا ہے اِنساں کا لہو

صنعت کا یہ طُوفان نہ ہوتا اے دوست
مُوجِد کوئی اِنسان نہ ہوتا اے دوست
ہوتا کوئی اگر جہاں کا خلّاق
تخلیق کا امکان نہ ہوتا اے دوست

ہوتا ہے تو ہو اہلِ ونارت سے لگاڑ
اِس قوم کے اسلحہ ہیں سب کاٹ کباڑ
میں، اور ہجومِ سفہار سے گھبراؤں
ذرّوں سے کبھی دبا ہے گم بھیر پہاڑ

عصیاں تابندہ و مبیں ہے، کیا ہو
عصمتِ، موہوم و سرنگیں ہے، کیا ہو
مُلحد کا ہے شیطان برافگندہ نقاب
مومن کا خدا پردہ نشیں ہے، کیا ہو

دل کانپ رہا ہے النجاؤں میں ہنوز
اِک کیف ہے بھگتی کی صداؤں میں ہنوز
دم توڑ چکا ہے آسمان پر بھگوان
گاندھی مصروف ہیں دعاؤں میں ہنوز

تمکیں کی جڑیں ہلا کے رکھ دیتا ہے
دامانِ خرد جلا کے رکھ دیتا ہے
اللہ وہ پُرہول تخیّل ہے کہ جو
ہر راست کو کج بنا کے رکھ دیتا ہے

دیواروں سے ناکوں کو رگڑ رکھا ہے
ایمان کے پنجے میں پکڑ رکھا ہے
تم جس کو گِرہ کُشنا کا دیتے ہو خطاب
اُس نے ہی تو تم سب کو جکڑ رکھا ہے

ہر نور سے فطرتًہ ہے خالی دُنیا
سُورج سے ہے بس چمکنے والی دُنیا
کیا جانیئے کون تھا وہ گورا خالق
جس نے کہ بنائی ہے یہ کالی دُنیا

جی بھر کے درخت کج روی کو چھوڑا

اوہام پہ آپس میں جھگڑنا چھوڑا

جب توڑ دیا دل نے خدا سے رشتہ

اِنسان سے ٹوٹا ہوا ناتا جوڑا

انساں جو کسی بات کا پرچار کرے

اُس بات پہ اپنے کو بھی طیّار کرے

" انکار خدا کرے نہ عقل محدود!"

لیکن یہ اجازت ہے کہ اقرار کرے

دن ہوتے نہ زرد رُو، نہ راتیں ہی سیاہ
بھولے سے بھی اک لب پہ نہ آتی کبھی آہ
اِنسان کے دل کو چھو نہ سکتے آلام
میرا سا اگر شفیق ہوتا اللہ

اَدیان کی جس وقت عمارت دیکھی
اُس وقت عجیب دل کی حالت دیکھی
دیکھے در و دیوار تو حکمت پائی
اور نیو کُریدی تو حماقت دیکھی

اب بھی رُخِ مذہب پہ ہے اِک گونہ چمک
اب بھی سینوں میں ہے خُداؤں کی کھٹک
قرنوں سے کھلاڑی ہیں زمیں کے پیوند
گیند اُن کا مگر لُڑھک رہا ہے اب تک

اللہ ری بانیانِ اَدیان کی آب
اُترا نہیں اب تک اُنکا دریائے شباب
یہ اُن کے ہی انفاس کی ہے سخت گرہ
ٹوٹے نہیں آجتک مذاہب کے حباب

طغیانیٔ حرفِ حق سے اللہ بچائے
بدبخت ہے وہ جس کو یہ ظالم اپنائے
لب پر آئے تو بدمزا ہوں احباب
اور دل میں اگر رہے تو پھوڑا بن جائے

جس چال سے بڑھ رہی ہے فوجِ برہاں
اوہام کا قلعہ ہو رہا ہے ویراں
جتنا اِنسان بن رہا ہے اللہ
اللہ اُتنا ہی بن رہا ہے اِنساں

کم رُو انسان سے کھلونا بہتر
بے عقل دراز قد سے بونا بہتر
تقلید کے پھولوں کے خنک بستر سے
تحقیق کے کانٹوں کا بچھونا بہتر

اے عقل کے دشمنو، خدائی خارو
اس طرح نہ انصاف کی گردن مارو
پکڑی جاتی ہے ہر خطا پر مخلوق
الّو کو نہیں کوئی پکڑتا یارو

افسوس ہے اے زاہدِ ژولیدہ نظر
کیا تجھکو نہیں مرے عزائم کی خبر
ممکن ہوتا اگر وجودِ اللہ
ہوتا بشریت پہ میں قانع کیونکر؟

یہ صورتیں دیکھی ہیں بہت کم میں نے
حوروں کے لئے چلا رہے ہو سینے
ہاتوں میں ہے تسبیح، لبوں پہ بُد بُد
کس غوطہ میں بیٹھے ہو میاں جی غلینے

ناکارہ، دَنی، طُفیلیے ہیں یہ لوگ
مکرُوہ ہیں، کان میلیے ہیں یہ لوگ
دربار کے مسخرے، عیاذاً باللہ
ابلیس کے بھی تھکیلیے ہیں یہ لوگ

اے طالبِ امرِ خیر و جویائے نجات
سُن غور سے اربابِ نظر کے کلمات
پیشِ وابستگانِ زُلفِ حکمت
جُھک جا، کہ یہ ہیں عُقدہ کشایانِ حیات

صرف اہلِ تفکّر کے مقالات میں جوش

آوازۂ دانش ہے بہ از بانگِ سروش

لیکن محرابِ زندگی میں صد حیف

جذبات ہیں پُرخروش حکمت خاموش

اِک حرفِ بلیغ کے لئے صُبح و مَسا

جَلتا رہتا ہے خُونِ انساں کیا کیا

جب ذہنِ مفکّر سے نکل پڑتی ہے لَو

تب ہوتا ہے اِک خیال صالح پیدا

ہر غار، مہ و سال سے پَٹ جاتا ہے
سایہ ہو کہ دھوپ، وقت کٹ جاتا ہے
غم ہے مانندِ برف ایسا اِک بوجھ
ہر گام پہ جس کا وزن گھٹ جاتا ہے

ظلمت کی بَلا سروں سے ٹل جائیگی
اِس شب کو، سحر آ کے مَسل جائے گی
کالے پیلے دھوئیں کے لچھّے ہیں تو کیا
اِن سب کو ابھی آنچ نگل جائے گی

جذبات کی شورشیں ہیں بیحد و شمار
روحِ انساں ہے ولولوں سے بیمار
ادراک کو اپنی ذات کا جزو بنا
افکار کو ہڈیوں کے گودے میں اتار

دل نے یہ کہا جہاں کو ویراں کر دے
غارِ ہستی کو نیستی سے بھر دے
نکلی اِک خوف و غم میں ڈوبی ہوئی چیخ
اُٹھے جو فریبِ زندگی کے پردے

سطحِ دریا پہ زندگی، زمزمہ، حال
قعرِ دریا میں حبس، ہیبت، جنجال
اے حُسنِ مجاز سے بہلنے والے
آ، دیکھ حقیقت کے بھیانک خط و خال

چلتا ہے جو وقتِ حلم کوئی نشتر
دُنیا اِک ضرب مارتی ہے ہنس کر
لگا ہے اِک مبہم آہ، اِک نیم نفس
انساں کو اُڑا دیتا ہے آندھی بن کر

رُخ پر جو کبھی شکن بھی پڑ جاتی ہے
حالات کی پوشاک اُدھڑ جاتی ہے
اِک حرفِ غلط سے، اِک نظر سے اکثر
دیکھا ہے کہ زندگی بگڑ جاتی ہے

اِک جھرجھری، خاک میں مِلا سکتی ہے
اِک لغزشِ پا گنو بیّں جھکا سکتی ہے
مژگاں کی، خلافِ وقت، اِک ادنیٰ جُنبش
انساں کو سُولی پہ چڑھا سکتی ہے

اک وضع پہ ہر چند ہے دُنیا ہمراز
لیکن اللہ رے اس کے ناز و انداز
ہوتا ہے کبھی کوہ میں گیتی کا نشیب
ملتا ہے کبھی کاہ میں گردوں کا فراز

آیات اگر پڑھے ہیں تفسیر بھی دیکھ
ہاں علت و معلول کی زنجیر بھی دیکھ
تقصیر تو دیکھ لی خدا کے بندے
زحمت جو نہ ہو باعث تقصیر بھی دیکھ

اچھی نہیں اے ندیم اتنی تعجیل
نارِ نمرود میں ہے گلزارِ خلیل
جس وقت بکھر جائیں گی لاکھوں رنگیں
تب ٹپکے گا نیم قطرۂ صبحِ جمیل

غاروں کو جو ذرّاتِ عمل سے پاٹے
وہ صاحبِ اوج، خاک کیونکر چاٹے
قدرت کا ازل سے ہے یہ حکمِ ناطق
جو شخص پسینہ بوئے، دریا کاٹے

ہستی تو ازل سے ہے مریضہ ساقی
ہر سانس ہے اک نیا عریضہ ساقی
اک سمت معاش ہے تو اک سمت ہے جنس
وہ قرض ہے اور یہ فریضہ ساقی

میں برسرِ حق ہوں اور بحجّت و قیاس
اس وہم میں ہے ہر ایک ناپختہ حواس
کھل جاتی ہے آدمی پہ راہِ عظمت
ہوتا ہے جب اپنی غلطی کا احساس

فطرت تری بیمار نظر آتی ہے
وحشت میں گرفتار نظر آتی ہے
اے منصفِ بے رحم تری آنکھوں میں
جلاد کی تلوار نظر آتی ہے

ہر شخص سمجھ سکتا ہے آسانی سے
ناداں کو جو آرام ہے نادانی سے
لیکن اُس بے پناہ اذیت کو نہ پوچھ
ہوتی ہے جو عقل کی فراوانی سے

بھاگے گا جو وقت کی صدا سے ڈر کے
پلٹے گا نہ گھر، وہ اپنی جھولی بھر کے
ہو جائے گا آلودہ خود اُس کا چہرہ
تھُوکیگا جو آندھی کی طرف مُنہ کر کے

نَے فکرِ دقیقہَ سنج، نَے عقلِ سلیم
بس حرف شناس ہے مدارِ تعلیم
جھانکا جب مَدرِسے کے تہ خانے میں
دیکھا کہ ہے دَبکا ہُوا اِک جہلِ عظیم

اِک عُمر کے بعد کام آتا ہے خضوع
کچھ کھیل نہیں کہ صُبحِ مقصد ہو طلوع
کرتے ہیں مُساعِدت جب اک لاکھ اُمور
واقع ہوتا ہے ایک امرِ مطبُوع

اِک ذرّے کی لَو زمیں ہلا سکتی ہے
اِک کاہ کی رَو، کوہ کو ڈھا سکتی ہے
ہر قطرۂ شبنم میں ہے اِتنی بجلی
جو آگ سمندر میں لگا سکتی ہے

ہر دِن پہ ہے اپنا پاؤں رکھے ہوئے رات
پوشیدہ ہیں ہر چیز کے خالص ذرّات
ہر بات کے جانچنے سے پہلے آدوست
اُس بات کی سَطح سے کھُرچ لے جذبات

چاندی کا ورق ہے یا گہر بار جبیں
اربابِ قلم کے مُلک ہیں زیرِ نگیں
عُنوانِ شعراء کا رُخِ گُل گوں پہ ہے رنگ
کیوں قبلۂ عالم آپ ناشر تو نہیں

دِل ڈوب گیا، خودی کو آیا چکر
پچھتائے بہت حرفِ تمنّا کہہ کر
اِک رائی کا بوجھ جب کہ شانے سے گِرا
دیکھا کہ لدا ہوا ہے پربت سر پر

ظلمات میں رُوپوش ہے قندیلِ شباب
بیوی ڈالے ہوئے ہیں چہرے پہ نقاب
تانگے والے کے پاس شوہر صاحب
دبکے ہوئے بیٹھے ہیں بصد شرم و حجاب

(٢)

آیا وہ انقلاب آیا، جاگو
فرمانِ شکستِ خواب آیا، جاگو
اے ہند کے بدنصیب سونے والو
سر پر وہ آفتاب آیا، جاگو

سنکی وہ ہوائے نَو، خدارا جاگو
دوڑی وہ فضا پہ لَو، خدارا جاگو
وہ کانپ رہا ہے دُودِ شمعِ سحری
وہ پھُوٹ رہی ہے پَو، خدارا جاگو

پُر شور ہے پھر رہ رَوِ بیدار کا دِل
لرزش میں ہے پھر کوُچہ و بازار کا دل
پھر تیشہ نَو ہُوا ہے وادی میں بلند
پھر جوش سے دھڑک رہا ہے کوہسار کا دِل

قندیلِ شب افروز کی لَو راہ میں ہے
خورشیدِ سحر تاب کی ضَو راہ میں ہے
پھر خاک کے دِل میں بج رہے ہیں ناقوس
شاید صنمِ حیاتِ نَو راہ میں ہے

گو جنگ کا ہو چکا ہے کب کا آغاز
گھوڑے حیراں کھڑے ہوئے ہیں بے ساز
افسوس کہ قوم کا سیاسی جھگڑا
دھوبی کے گدھے کھینچ رہے ہیں ہمراز

محرومِ تب و تاب ہے ہر نیک معاش
تیزی، نہ تلاطم، نہ تجسّس، نہ تلاش
ہر ظلم کے تخت کو اُلٹ کر رکھ دیں
سیدھے ہو جائیں آج اگر چند اوباش

پھرتے ہیں لدے جو آج یہ بیچارے
اِن کے مرکب بنیں گے سُلطاں سارے
محلوں میں بندھے ہوئے ہیں اُن کے خچر
سڑکوں پہ جو پھر رہے ہیں مارے مارے

وہ بابِ سحر کھُلا، وہ دوڑی تنویر
وہ زلفِ طرب کھُلی، وہ ٹُوٹی زنجیر
گُل رنگ ہوا وہ خوابِ فردا کا اُفق
وہ دیکھ کرن کی طرح پھُوٹی تعبیر

اِس ظاہری صُورت پہ غریبوں کی نہ جاؤ
کر دینگے اُمیروں کا یہ اک دن پتھراؤ
دِل سے جو ٹپکتی ہیں لَہُو کی بُوندیں
ہر بُوند میں ہوتا ہے سمندر کا دُباؤ

اُٹھ[1] چرخِ کہُن پہ کاش تارے نہ رہیں
لرزاں ہوں پہاڑ، اور دریا نہ بہیں
یہ عشوہ فروش آجکل کے لونڈے
آزاد سے مردِ حق کو شو بوائے کہیں

[1] حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی شان میں لاہور کے چند ملّا سے (——— SHOWBOY) کا لفظ [illegible] صاحب کے اتباع میں استعمال کیا تھا



اے جبرِ خلوص سے نہ ڈرنے والے
اے شامِ وسحر حد سے گزرنے والے
ایک اور عدوئے جاں مبارک باشد
احساں کا پھر ارتکاب کرنے والے

اے وائے وہ انکسار ٹھہرے جو غرور
افسوس وہ سعیٔ حق نہ ہو جو مشکور
ایسے عملِ نیک پہ صد حیف اے جوش
انساں کو جو معذرت پہ کر دے مجبور

آؤ، مشکل تمہاری آسان کروں
اموال تو کیا، جان بھی قربان کروں

لیکن لب پر نہ لاؤ لفظِ احساں
میں اتنا دنی نہیں کہ احسان کروں

حاجت مندی کی رُوح تھرتھراتی ہے
لیلائے خودی شرم سے چکراتی ہے
امداد جو کرتا ہے تو آنکھیں نہ ملا
اس شے سے انا کو ٹھیس لگ جاتی ہے

انساں شرمندگی سے کتراتا ہے
محسن کے تصوّر سے بھی دُکھ پاتا ہے
احسان کو احسان کی صورت سے نہ کر
احسان خُودی کی رگ میں چُبھ جاتا ہے

جب اپنی ہی ذات کا گنہگار ہے تُو
کیوں مجھ سے معافی کا طلبگار ہے تُو
اے شخص عیاں کر کے خباثت اپنی
میرا نہیں، خود اپنا خطاوار ہے تُو

اپنے اعمالِ زشت پر غور تو کر
میں دل سے تجھے معاف کرتا ہوں۔ مگر
تیری فطرت میں خم ہے اور دل میں کجی
اس علم کو میں جہل سے بدلوں کیونکر

میں پھر سے تجھے دل میں بٹھاؤں کیونکر
ایماں ترے اخلاص پہ لاؤں کیونکر
فطرت کو تری دیکھ چکا ہوں ننگا
اس دیدہ کو نادیدہ بناؤں کیونکر

آنکھوں کی چمک سے روحِ نفرت جھانکی
لہجے سے منافق کی خیانت جھانکی
اظہارِ صفائے قلب جب اُس نے کیا
آواز کی آڑ سے کدورت جھانکی

افکارِ حسن سے دل کی تطہیر کرو
طینت کی صفائی میں نہ تاخیر کرو
مقصود اگر ہے شہرِ اخلاص کی سیر
پُل سینۂ بے کینہ کا تعمیر کرو

تُو، اور سرِ مُخبریؔ و عزمِ دغا!
یہ بات غلط ہے، مگر اے مَردِ خُدا
آنکھوں سے تری ایک نشہ کا رہی گُتّا
آ آکے مجھے سُونگھ رہا ہے، یہ کیا؟

سو بار اُمیدِ رحمت میں گا یا
مانندِ شجر بشر ایک انساں پایا
اپنے پہ جو رد کرتا ہے جلتی ہوئی دُھوپ
انساں کو بخشتا ہے ٹھنڈا سایا

ہم غنچۂ گیتی کو مَسل دیتے ہیں
بخشش قدرت کا مَسل دیتے ہیں
ہم سے تو شریف تر ہیں بے جان درخت
ہم لیتے ہیں قیمت اور وہ پھَل دیتے ہیں

اپنوں کو جو ڈھونڈتا ہے کیا تُو ہے وہ نائیؔ
یا مذبحِ احباب کُشی کا ہے قصائیؔ
سینے پہ ترے چمک رہے ہیں تمغے
ان کو رکھ کے داغوں کو چھپالے اے بھائیؔ

تا چند یہ علم و فضل و تنقید[1] کا ڈھول
ہر فرد پہ کھل چکا ہے اِس ڈھول کا پول
از راہِ نیاز کہہ رہا ہوں تم سے
اب بھائی اُتارو ہمہ دانی کا یہ خول

شکلوں کو بگاڑ کر دکھانا چھوڑو
تاریک ہے، یہ نگار خانہ چھوڑو
بُو آتی ہے اِس رَوِش سے نیچے پن کی
اُونچے لوگوں کا مُنہ چڑھانا چھوڑو

[1] اب اِس قبیل کے الفاظ کیساتھ ترکیب کو جائز کردو۔ زبان کی وسعت کے حق میں مفید ہے

طیّار ہوں آپ، کم نگاہی کے لئے!
آمادہ ہوں اور مری نباہی کے لئے!!
میں نے حضرت سے کل جو کی تھی نیکی
آج آیا ہوں اُس کی عُذر خواہی کیلئے

ابرو میں لچکتی ہے سخاوت کی کمان
چہرہ کہتا ہے دیکھ یہ خُلق کی شان
یوں کرتے ہیں اعترافِ احساں کچھ لوگ
گویا محسن پہ کر رہے ہیں احسان

بنتا ہے کوئی مُول رفیقوں سے لڑائی
کرتا ہے کوئی نیاز مندوں کی بُرائی
میں نے جو خدمتیں تمہاری کی ہیں
اُن خدمتوں کو معاف کردو اے بھائی

افسوس یہ روز ملنے والے "احباب"
یک رنگیٔ زندگی کا اللہ رہے عذاب
ٹھِٹھری ہوئی چنگاریاں سیلی ہوئی دُھوپ
یخ بستہ لب و لہجہ، تبسّم نایاب

بدبخت ہے وہ جس نے حقیقت دیکھی
صُورت کا حجاب اُٹھا کے سیرت دیکھی
لوگوں کے دلوں میں سے جو ہو کر گزرا
قے ہو گئی اِس حد کی غلاظت دیکھی

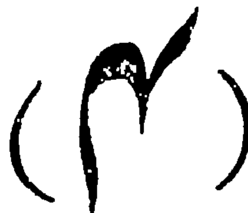
بے کیفیِ ہمّت نہیں ہوگی تجھکو
کہنے کی اذیّت نہیں ہوگی تجھکو
پھل توڑ لے خود آ کے مری شاخوں سے
اِس طرح خجالت نہیں ہوگی تجھکو

احباب کے کوچے میں نہ ٹہلا دل کو
دُکھتے ہوئے ہاتوں سے نہ سہلا دل کو
اچّھا نہیں محفلوں کا چسکا ناداں
خود اپنے سے ہنس بول کے بہلا دل کو

عفریتِ ہوس پہ دل کو سزا کیا دو گے
ہستی کے مُبطّل کو سزا کیا دو گے
انسان کے قاتل کو اگر کرتے ہو قتل
احسان کے قاتل کو سزا کیا دو گے

ہر شخص کو دعویٰ کہ ہوں لاثانی
اب تک نہ مری قدر کسی نے جانی
دیکھا جو گھڑا تو چل کے چھلنی نے کہا
اندھوں نے بھرا کبھی نہ ہم میں پانی





رہتا ہے دماغ سوئے کاوش ہی رجوع
راتوں کو بھی خورشید ہی ہوتا ہے طلوع
اربابِ دول کو نیند آتی ہی نہیں
اللہ رے انتشارِ طبعِ مجموع

سونا ہے اک آزار یہ کس کو سمجھاؤں
چاندی ہے کفِ مار یہ کس کو سمجھاؤں
دولت سے بھری تجوریوں کے مالک
کس حد کے ہیں نادار یہ کس کو سمجھاؤں

آنکھوں میں یہ طمطراق، رُخ پر یہ ترنگ
یہ چال کہ جس سے دنگ ہو موجۂ گنگ
حالانکہ ترے رُخ پہ ہے اے خسروِ زشت
ناداروں کے چہروں کا اُڑا یا ہوا رنگ

کلیاں چوری کی کھِل رہی ہیں دیکھو
لُوٹی ہوئی صُبحیں مِل رہی ہیں دیکھو
چھینی ہوئی لاکھوں کے چراغوں کی لویں
مُنعِم کے کنوَل میں ہِل رہی ہیں دیکھو

جو صاحبِ نعمت ہیں وہ ہیں سب اوباش
جو اہلِ نظر ہیں وہ ہیں معتوبِ معاش
مُفلِس کی نگاہ میں ہے روٹی کی طلب
مُنعِم کی نظر کو مسخرے کی ہے تلاش

کردار میں تیزی ہے نہ شفّافی ہے
جذبات میں حسّیت ہے نہ برّاقی ہے
ہر چیز بہ افراط ہوئی جب حاصل
دیکھا کہ کوئی چیز نہیں باقی ہے

ہمت نہیں اُس دَنی کی میری ایسی
جھیلیں ہیں بلائیں میں نے کیسی کیسی
ہر ذرّہ الف ہو کے یہ دیتا ہے صدا
خورشید جہاں تاب کی ایسی تیسی

احساس کے دانت ہو چکے ہیں کھٹّے
مُنعِم مفلس پہ مارتا ہے ٹھٹّے
ہاں سچ ہے کہ ہر آن جو سُنتا ہے سوال
پڑ جاتے ہیں اُس شخص کے دل میں ڈھٹّے

دربارِ ہو محنت کے پسینے سے جبیں
اِس سے بڑھ کر کوئی سعادت ہی نہیں
لیکن اس طور سے طلب کر درماں
درماں خود درد سے نہ بڑھ جائے کہیں

اے عمرِ عزیز کے گنوانے والے
یہ لمحے نہیں پلٹ کے آنے والے
دل کو کوئی مار نا ہے اِتنا پئے زر!
اے خاک پر اکسیر لٹانے والے

ہر آن نرالا خوف جکڑا تا ہے
ہر لمحہ نیا وسوسہ تڑپاتا ہے
حیرت ہے کہ تجکو رشک آتا ہے ندیم
مجکو تو امیروں پہ ترس آتا ہے

یہ بھی ہے تمدّن کی نرالی اک شان
سُلطان، گدا بنے، گدا ہو سُلطان
ہاں بینک کے اِس آہنی پھاٹک کو تو دیکھ
چاندی مسند نشیں ہے لوہا دربان

ہر چند کہ رکھتا ہے روانی دریا
اُس پر بھی ہے غرقِ سرگرانی دریا
جاگیرِ گدا پر ہے نگاہِ سُلطاں
کوزے کا چُرا رہا ہے پانی دریا

اے تشنہ وہاں بجز گدا گر سُلطاں[۲]
اے سارقِ دُردِ تہ نشینِ پیرِ مُغاں
جتنا کہ ترا قصرِ درم ہے آباد
اُتنا ہی ترا شہرِ کرم ہے ویراں

[۱] [۲] ایک [illegible] طرف [illegible] کی طرف اشارہ ہے جس نے منصب کو جاگیر غصب کر لی ہے یہ [illegible]
جاگیر کے غصب ہونے کے آثار دیکھ کر کہی گئی تھیں

اے[۱] شاہِ فلک نشیں بہت پست ہے تو
میخانۂ تجمّل کا سیہ مست ہے تو
تو جتنا بھی پُر جیب و گراں کیسہ ہے
اُتنا ہی سُبک سر و تہی دست ہے تو

مُنعم[۲] بہ ہوا و ہوس و حرصِ شدید
مُفلس سے کیے ہوئے ہے وابستہ اُمید
قطرے کے مکاں میں نقب زن ہے قُلزم
ذرّے کی گرہ کاٹ رہا ہے خورشید

[۱] [۲] یہ دونوں رباعیاں بھی گذشتہ صفحے کی رباعیوں کے خاندان سے ہیں۔

صُورت ہے بہت ہی سیٹھ جی کی کالی
ہے صدر و شکم کے درمیاں اِک نالی
نوڑے بھاری ہیں اور جیبیں بھرپور
باتیں ہلکی ہیں، اور آنکھیں خالی

آنکھوں سے نکل رہی ہے وہ حرص کی بھاپ
جس بھاپ میں پن ہی نظر آتا ہے نہ پاپ
کل والدۂ ماجدہ کے بطن میں تھے
خود اپنے شکم میں آج پوشیدہ ہیں آپ

صُورت ہے کہ بھُوت گھر کی انگنائی ہے
چَوڑائی سے لڑتی ہوئی لمبائی ہے
ابلیسِ لعین کی سب سے گندی گالی
چہرہ بن کر ترا اُبھر آئی ہے

اِن کا نہ کبھی کوئی نشانہ چُوکا
شیطان ہے اِن کے آگے ننگا بھوکا
اِن مُردہ ریاستوں کے والی ہیں وہ پِل
جس نے رکھّا زباں پر اُس نے تھوکا

افسوس کہ گھر پھونک کے اُگا[1] پایا
تن گھلنے کے بعد ایک تنکا[2] پایا
آنکھیں نہ رہیں تو چاند آیا بر میں
جب داغ پڑے دل پہ تو سکّا[4] پایا

باطل کا سدا پڑھا قصیدہ[6] اُنّو نے
حق کو خود سے کیا کشیدہ[7] اُنّو نے
اپنے دل کے لہو کی سُرخی دے کر
چاندی کی سفیدی کو خریدا اُنّو نے

۱ ایک ماچس ۲ شمع کا تاگا ۳ چھلنی ۴ روئی کا گالا ۵ سکّہ ۶ قصیدہ ۷ کشیدہ۔



(الف)

ہر صبح کو نانِ گندۂ و آبِ حرام
ہر شب کو مشاعروں میں اسلام، اسلام
میزانِ عمل ہے نصب ہونے والی
تاکے یہ فریب اے فرنگی کے غُلام

تفتیش سے کیوں سانس تری اُڑتی ہے
گویا سینے میں کوئی شے گڑتی ہے
دل میں کیا چور ہے کہ تیرے منہ سے؟
اک سوندھی سی رہ رہ کے نکل پڑتی ہے

اِک سمت غِنائیوں کے افسر بھی ہیں آپ
اِک سمت اُمید وارِ منبر بھی ہیں آپ
پیرو ہیں رسولِ عربی کے بھی حضور
اور خیر سے بُوجہل کے چاکر بھی ہیں آپ

ہر بزم میں ایماں کا صلا لیتا ہے
ہر سانس میں نامِ کبریا لیتا ہے
ہم کیا ہیں وہ مُردہ خوار اُچکا ہے کہ تُو
شیطان کے لُقمے کو اُڑا لیتا ہے

اے شپرہ چشم، روشنی کے دشمن
خیّاطِ عبائے غاصبانِ پُرفن
ہونے کو ہے صبح، دیکھ خیطِ ابیض
کس غار میں اب چھپے گا غدّارِ وطن

تُو راہِ غنا پہ جب کہ چل پڑتا ہے
اِک چشمۂ دریوزہ اُبل پڑتا ہے
جیسے ہی کہ لب کھلتے ہیں گانے کیلئے
اِک کاسہ ترے مُنہ سے نکل پڑتا ہے

(ب)

دیکھا ہی نہیں ایسا پراگندہ پڑاؤ
کھلنا ہی نہیں غزل کے اشعار کا بھاؤ
اک دوسرے سے بیٹھے ہیں منہ کو موڑے
کیسی یہ برادری ہے، للّٰہ بتاؤ

بے ربط ہے اہلِ بمبئی کا کردار
ہم رشتۂ بمبئی ہے، پیوستہ بسیار
رہتے تو ہیں ایک گھر میں لیکن اس طرح
آپس میں ہوں جس طرح غزل کے اشعار

سینے پہ غزل سرا چلاتے ہیں چھری
کرتے ہیں سُرودِ شعر کی خانہ پری
گردن کو اٹھا کے ہن ہناتے تو ہیں خوب
لیکن یہ لوگ لید کرتے ہیں بُری

نا بھائی، مشاعروں میں اب میں جاؤں
جہاں کو گانے کے عوض شعر سناؤں
اب مجھکو نہیں رہا ہے اس بات کا شوق
بھینسیں پگلائیں اور میں بین بجاؤں

یہ صنفِ غزل کہ جس سے خوش ہیں اوباش
کیا چیز ہے، کیا بتاؤں اربابِ تلاش؟
سِلے ہوئے الفاظ کے تابوت میں ہے
یہ مُردہ روایات کی بگڑی ہوئی لاش

فطرت مری نظروں سے گراتی ہے مجھے
جس وقت مشاعروں میں پاتی ہے مجھے
ہوتا ہوں جو نرغے میں غزل گویوں کے
اپنی عظمت سے شرم آتی ہے مجھے

ذہنوں کو مرا سُخن غذا دیتا ہے
اور گیت ترا صرف ہوا دیتا ہے
تُو دُھونکنی ہے جو کہ پھلا دیتی ہے
میں شعلہ ہُوں دل کو جو ضیا دیتا ہے

تجھ پر اُس شاعری کا در ہے مسدُود
بنتا ہے جہاں بشر خدا کا محسُود
تو راگ کا طُول و عرض رکھتا ہے ضرور
تخیل کی ہے مگر بلندی مفقود

جب حاصلِ شاعری ترنّم ٹھہرے
کیوں جا کے نہ دل پہ نقشِ گندم ٹھہرے
اب تو ہے مشاعروں کے کھیتوں کا یہ حال
جو مسخرہ "جو" گائے، وہ "گندم" ٹھہرے

جیبیں لفظوں سے بھر رہے ہیں شُعرا
جھک جھک کے سلام کر رہے ہیں شعرا
گا گا کے مشاعروں کے میدانوں میں
تعریف کی گھانس چر رہے ہیں شعرا

رفتار کو میں دوچند کر کے گزرا
منہ موڑ کے، سر بلند کر کے گزرا
بو آئی جو فرسودہ غزل بافوں کی
میں راہ سے ناک بند کر کے گزرا

یوں داد کے وقت سر ترا ہلتا ہے
شاعر کو مزا کچھ بھی نہیں ملتا ہے
سنتا ہے جو اشعار تو آنکھوں میں تری
اشعار کا مفہوم نہیں کھلتا ہے

ہر ایک غزل سہرا ہے مکڑی گویا
ہر شعر ہے کھیرا اور ککڑی گویا
مضموں کے ٹٹولنے میں کام آتا ہے
ہر قافیہ اندھے کی ہے لکڑی گویا

وہ نغمہ فریب، وہ تخیّل ہے سراب
جس کی خالق ہو قافیے کی مضراب
چشمے کی طرح پھوٹ کے نکلے جو خیال
صرف اس کیلئے شعر کا موزوں ہے خطاب

حسرتؔ[1] سے خوش آواز گویّا بہتر
تخیّل کی جھنکار سے طبلا بہتر
جہّال کو گُد گُدا کے خوش کرتا ہے
حقّی کہ غزل گو سے "غزل گا"[2] بہتر

مضحک ہیں بہت ہی شاعرانِ نے باز[3]
ریچھوں کے رفیق، بندروں کے دم ساز
نامِ شعراء پکارتا ہے جب صدر
آتی ہے مجھے تو ڈُگڈُگی کی آواز

۱ حسرت موہانی ۲ غزل گانے والا ۳ اِس قبیل کی ترکیبوں کو جائز قرار دیا گیا ہے

غزلوں کو مزے کے ساتھ گا گا کے پڑھو
جُہّال کی داد کے یہ خچّر ہیں ــــ پڑھو
وہ کھیل کی، اے نٹو بجی، وہ گھنٹی
ہاں ہاں چڑھو آواز کی ڈوری پہ چڑھو

کرتے ہیں تصوّف کی ورق گردانی
تا شعر پہ چھا جائے گھٹا رُوحانی
اِس دُھن میں کہ دُنیا کو نظر آئے عمیق
گندلا کر لیتے ہیں یہ اپنا پانی

جو امر کہ جہّال کو بہلاتا ہے
مٹّی کا کِھلونا وہ نظر آتا ہے
ملتی ہے مشاعِرے میں جس شعر کی داد
وہ شعر مری نظر سے گِر جاتا ہے

ہوتی ہے مشاعِروں میں بُو گھُورے کی
حاجی بخش اللہ کی میاں بھُوربے کی
صد حیف کہ اِس عطرِ سخن کو اپنے
بھرتا ہوں میں شیشیوں میں قارُورے کی

ثابت نہ کر اپنے کو بکھے از جہاں

بستے کو بغل میں داب، پوتھی کو سنبھال

مجکو نہ سمجھا شعر و ادب کے نکتے

نافہم نہ بن، نمک سمندر میں نہ ڈال

گا گا کے سنا رہے ہیں شاعر کو زبور

جس میں ہے فقط شمعِ حرم، شعلۂ طور

سوکھے ہوئے گڑ کی ایک پڑیا لے کر

آئے ہیں شکر کے کارخانے میں حضور

بے چین ہیں آپ گیت گانے کیلئے
شاعر کو غزل سی شے سنانے کے لئے
بدھنی ہیں لئے، وہ بھی وضو بھر پانی
آئے ہیں سمندر کو چھپانے کے لئے

جب قافیے سے ردیف آکر ٹکرائی
خوشبو جو اڑی تو واہ، بدبو تو دہائی
خوشبو ہی نہ قبضے میں، نہ بو قابو میں
شرماؤ ذرا دل میں، یہ کیا کھیل ہے بھائی

تُو اور جہاں محل کے دھندلے کچھ طاق
میرے پیشِ نظر ضمیرِ خلّاق
تو وقت کے لہجے کو فقط سنتا ہے
پڑھتا ہوں میں آیاتِ بطونِ آفاق

دانا پہ کبھی آنچ نہیں آتی ہے
میں وہ ہوں کہ جس سے برق تھراتی ہے
جو آگ حریف مجھ پہ برساتے ہیں
وہ برف کی بھاپ بن کے اڑجاتی ہے

اپنے کو سُلگتا ہوا جب پاتے ہیں
شُعلے ہم عصر مجھ پہ برساتے ہیں
لیکن وہ مرے بدن سے مس ہوتے ہیں
بُجھ جاتے ہیں، راکھ بن کے اُڑ جاتے ہیں

سب آپ کے ہم عصر ہیں مردود و لعیں؟
ہر فرد ہے شایانِ سزا و نفریں؟
احباب میں آپ کے نہیں کوئی شریف؟
کیوں بندہ نواز آپ شاعر تو نہیں

بس کیجئے ختم، سُن چُکا میں غیبت
غیبت نہیں، توبہ شاعروں کی سیرت
اُن سب کے تخلص سے تو آگاہ کیا
اب اپنا تخلص بھی بتاویں حضرت

جادُو نہ کہو، اور نہ اعجاز کہو
دیوار سے پلٹی ہوئی آواز کہو
تیتر بازوں، بٹیر بازوں کی طرح
شاعر نہ کہو، اِنہیں غزل باز کہو

اے اہلِ غزل، بلند و بالا ہُوں میں
چشمِ شعر و سخن کا تارا ہُوں میں
تم لوگ جو آج کو تو مجھے دیکھ سکو
اور تم کو، جھکاؤں تو دیکھ سکتا ہوں میں

تم پر طاری ہے فکرِ بیہودہ ہنوز
سر پر ہے وہی چادرِ فرسودہ ہنوز
میں شمس و قمر سے ہو چکا ہوں فارغ
اور تُم ہو خس و خار میں آلودہ ہنوز

آخر کس امید پہ کنایات و نکات
کیوں لب پہ نہ لاؤں یہ گہر جیسے کلمات
اونچا نہ اگر تمہیں سنائی دیتا
میں غنچہ و شبنم کی طرح کرتا بات

جن کا پیشہ ہے افترا و بہتاں
رہتے ہیں مرے خلاف جو شعلہ فشاں
وہ لوگ مرے حضور جب آتے ہیں
رہ جاتا ہے شعلے کی جگہ صرف دھواں

موزوں فقروں پہ اور یہ پندار، خموش
اے اہلِ غنا کے کفش بردار، خموش
تیرا منہ اور شاعری کا دعوے
پُر بستہ قوافی کے چڑیمار، خموش

اِس صنفِ سخن میں ہے نہ زمزم نہ شراب
دریا کے لباس میں پر افشاں ہے سراب
اِک نوع کا حُسن ہے غزل میں، لیکن
مدقوقہ نیم جاں کا جس طرح شباب

٩)

ہر سلسلۂ غیر آزمودہ ہے ہنوز
عقلِ نوعِ بشر غنودہ ہے ہنوز
افسوس کہ یاروں کا ہے رخ سوئے سما
اور عقدۂ ارض ناکشودہ ہے ہنوز

اوہام کے نزلے میں گرفتار نہیں
صد شکر مرا دماغ بیمار نہیں
ہاں ہاں میں آسمان کا ہوں باغی
حاشا کہ زمین کا خطاوار نہیں

جب تک کہ یہ آسمان تھا مرکزِ دید
غایت تاروں سے تھی فقط گفت و شنید
سمجھا ہوں زمیں جب سے مفہوم ترا
ذرّوں سے اُگا رہا ہوں لاکھوں خورشید

پوشیدہ ہیں اِس زمیں کی ہر تہ میں علوم
اِک عشوۂ خاک ہے صبا ہو کہ سموم
پتھّر پہ ہو اِک خط سا کہ پتّے میں شکن
اِک چیز بھی واللہ نہیں بے مفہوم

فطرت کے عجب کھیل ہیں کیا تجھ سے کہیں
خورشید کے واقعات ذرّوں میں رہیں
قرنوں کی ہیں جن میں داستانیں محفوظ
ماضی کی وہ مثلیں ہیں چٹانوں کی تہیں

ہر چند مفکّر، نہ محقّق ہوں میں
جو لانگہِ ہر یقین واثق ہوں میں
اے کھولے آسمان شاہد رہنا
اِس ٹھوس زمین کا مُصدّق ہوں میں

تیشہ کام اپنا کر رہا ہے دیکھو
تصویر کا خول اُتر رہا ہے دیکھو
بھدّے پتّھر کے اُڑ رہے ہیں پُرزے
مہ پارہ صنم اُبھر رہا ہے دیکھو

احساس کے گلزار میں ہو نغمہ سرا
نزہت گہہ افکار میں ہو نغمہ سرا
کیوں عرش کی ظلمت میں پڑا ہے خاموش
آ ، فرش کے انوار میں ہو نغمہ سرا

نا قابلِ اصلاح ہیں اربابِ یقیں
اُدھل ہے ان آسمان والوں سے زمیں
جب عرش سے رُوح کو اُتار انو کھُلا
اک عربدۂ جسم ہے اور کچھ بھی نہیں

اے معتقدانِ آسمانِ باطل
انسان کی صرف یہ زمین ہے منزل
کیا تم کو خبر کہ اِس زمیں کی خاطر
کس طرح دھڑک رہا ہے آفاق کا دل

کیا عرش میں ہے فرشِ بریں کو دیکھو
تم طفلِ زمیں ہو، اِس زمیں کو دیکھو
کیا دیکھ رہے ہو آسماں کی جانب
اِس عشوہ گرِ فلک نشیں کو دیکھو

گیتی کو سنوارتی، سنورتی اُبھری
تصویرِ جہاں میں رنگ بھرتی اُبھری
پانی سے طرب کے پھوٹ نکلے چشمے
جس وقت حیات رقص کرتی اُبھری

(الف)

کیا قہر ہے سوچنے کی عادت اے جوشؔ
ملتی ہی نہیں ذہن کو فرصت اے جوشؔ
ہر غرفے کو کھٹکھٹاتا رہتا ہے دماغ
دانائی بھی ہے کتنی حماقت اے جوشؔ

اِک فتنہ ہے ناقصوں میں کامل ہونا
اِک قہر ہے وابستۂ منزل ہونا
تاریخ کے اوراق جو اُلٹے تو کھلا
اک جرم ہے احمقوں میں عاقل ہونا

مُصلح کو سیہ کار کہا جاتا ہے
صحت کو اک آزار کہا جاتا ہے

وہ آدمی چھوٹوں میں جو ہوتا ہے بڑا
گم راہ و گنہ گار کہا جاتا ہے

نظر میں ہیں مری ناقدِ اسرار نہاں
دل سے ناخنِ عقدۂ جہانِ گزراں

وہ ذرّہ ہوں جو ہو جائے گا جس میں پیدا
اک روز امیرِ آفتابِ تاباں

ہر آن ہجومِ قہر و طغیانِ عذاب
ہر لمحہ خروشِ بحر و شور و گرداب
اُس قطرۂ آب کی تباہی کو نہ پوچھ
جو فکرِ مآلِ بحر سے ہے بیتاب

گیتی پہ ہوں زندگی کا قاصد گویا
سینے میں لیے ہوں قلبِ ابزد گویا
ہر چیز کا وہ درد ہے میرے دل میں
آفاق کا ہوں والدِ ماجد گویا

اللہ کرے تم بھی بنو مشعلِ طور
تم بھی ہو شرابِ روشنی سے مسرور
جس نور کا آشیاں ہے میرے دل میں
اے شمس و قمر تمہیں بھی حاصل ہو وہ نور

اِک خیمہ سا مجھ پہ تن رہا ہے شاید
آزردہ سکون من رہا ہے شاید
جذبات رواں ہیں سوئے قصرِ دانش
دل جزوِ دماغ بن رہا ہے شاید

ـسے ہوں میں، حق کو نہیں یہ منظور

ـ بہت قریب ہیں، وہ بھی ہیں دُور

ـنا ہُوں بزم و بازار میں بھی

ـے ہُوئے مجھ کو یوں ہے اک حلقۂ نُور

ـں کی مجھے ندیم تلقین نہ کر

ـری عقل کی توہین نہ کر

ـہے کہ بن جاؤں گا دیندار اک روز

ـزندہ ہوں زندگی کی تدفین نہ کر

کیا چاک کروں گا حق کا دامن میں بھی
افکار کا پھونک دوں گا خرمن میں بھی؟
کیا واقعی بن جاؤں گا تجھ سا مومن
کیا عقل کا ہو جاؤں گا دشمن میں بھی

اِترا کے مرے حضور گردن نہ اُٹھاؤ
یہ بارگہِ بلند ہے، ہوش میں آؤ
اَلوند و ہمالہ و اُحد ہو تو کیا
کیوں سامنے اے پستہ قدو آئے ہو جاؤ

ہم پیشہ و ہمراز سے لڑ بیٹھتے ہیں
دل پُر درد و دم ساز سے لڑ بیٹھتے ہیں
اللہ و شہنشاہ کا کیا ذکر اے جوشؔ
ہم دلبرِ طنّاز سے لڑ بیٹھتے ہیں

اِس طُرفہ چبھن کو قلب کیونکر جھیلے
رگ رگ میں تشنّج کے ہیں کتنے ریلے
اِس ماہ جبیں کا ــــ جو ہے یوں گرمِ خرام
بڑھ ــــ اور چُھری مار کے بوسہ لے لے

چڑیوں کے چہکنے کی صدا آتی ہے
رو رو کے تمنّائے منشی گاتی ہے

اللہ رے بیکسی کا عالم جس وقت
کُھلتی نہیں آنکھ نیند اُچٹ جاتی ہے

بدبخت ہے وہ جس سے پڑے حُسن پہ بار
شایانِ غم خزاں ہے معتوبِ بہار
جس سے کہ مکدّر ہو دلِ نازک دوست
وہ دامنِ برگِ گُل کا گویا ہے غُبار

بڑھتا ہوں کبھی، کبھی ٹھہر جاتا ہوں
جیتا ہوں کبھی، اور کبھی مر جاتا ہوں
گر پڑتا ہوں ذرّات سے ٹھوکر کھا کر
اور گاہ پہاڑوں سے گزر جاتا ہوں

ترتیبِ سپاہ، اور تنظیمِ عوام
دونوں سے بلند تر ہے شاعر کا مقام
تالیف و مزاج پُرسی و چارہ گری
میرا نہیں، پیغمبروں کا ہے یہ کام

تعمیر پہ خالق کو نہ مجبور کرو
تخلیق کو پھر کون سنبھالے گا، کہو
شاعر کو پکارو نہ مشقّت کی طرف
بھینسے کا جو کام ہے وہ گھوڑے سے نہ لو

کیوں رنگ مرا زرد ہے کس کو سمجھاؤں
کیوں یہ نفسِ سرد ہے کس کو سمجھاؤں
تعمیر کی زحمت سے پریشاں ہیں رفیق
تخلیق میں کیا درد ہے، کس کو سمجھاؤں

یہ دل نہیں امروز کے غوغا کے لئے
یہ رُوح ہے اک بعید دُنیا کے لئے
وہ حرفِ بلند ہُوں جو غلطیدہ ہے
بازوئے ہوا پہ گوشِ فردا کے لئے

گو لعل کی یہ رات ہے پکھراج کی رات
کچھ میرے لئے فخر نہیں آج کی رات
مجھ سے ملنے کو جب زمیں پر آیا
حاصل ہُوئی اللہ کو معراج کی رات

میرے میداں کی ایک گھاٹی ہے فلک
جاتی ہے مری گردِ قدم عرش تلک
وارِد ہوتی ہے جب بلندی میری
چنگھاڑ کے گھٹنے ٹیک دیتا ہے فلک

واقف نہیں میرے کرّ و فر سے دم ساز
انجام حریفاں سے ہے میرا آغاز
شاخِ گاوِ زمیں پہ اکثر دمِ فکر
ہوتا ہے مرا جہاز لنگر انداز

کیا، خُون کی اِک بُوند میں خنجر ڈوبے؟

آیئنے کی آب میں سکندر ڈُوبے؟

میرا، اور سر جھکائے شاہی و خُدائی للہ

اِک قطرۂ آب میں سمندر ڈوبے!!!

ہاں اے سرِ چرخ جبرئیل کے اکلیل

اے عرش کے ساکنان ذی قدر و جمیل

میرے اعصاب کا دہکتا لوہا

ہشیار کہ ہو رہا ہے کُندن میں تبدیل

زُہّاد ہی کو نہیں ہے غیظ و اندوہ
مُجھ سے ناخُوش ہے شاعروں کا بھی گروہ
میری تر دامنی پہ گویا اے جوشؔ
کرتی ہیں مٹک کے بی گھٹا بھی "افوہ"

فطرت، مجھے تکمیل پہ اُکساتی ہے
ہر ضعف کو، ہر نقص کو مٹواتی ہے
لے جاتی ہے سوئے ناقصاں مجکو وہ شے
لوہے کی طرف جو گھن لو لے جاتی ہے

ظلمات میں روشن ہے مرا ذہنِ منیر
آفاق کے پاؤں میں ہے میری زنجیر
غاروں میں مجاز کے اُتر کر اکثر
کرتا ہوں حقیقت کے منارے تعمیر

خم دیتا ہوں ہر لوچ کو تلواروں کا
ذرّوں کو پلاتا ہوں لہو تاروں کا
ذہنِ انسان کے خاروخس کے حق میں
اِک کھولتا فوّارہ ہوں انگاروں کا

میں، دیکھ سکوں، اور یہ تماشا، تا دیر!

پردے کو گرا جلد، کہ دل ہو گیا سیر

لیلائے تخیّل کی انگوٹھی سے بھی کم

اے بارِ خُدا، یہی ہے آفاق کا گھیر

اُڑنے کی تمنّا نہ کبھی بر آئی

کس درجہ فضا کی، ہیچ ہے پہنائی

پرواز کو اِک ذرا جو شہپر کھولے

آفاق سے شہپروں نے ٹکّر کھائی -

عفریت، خبیث، دیو، اژدر، شیطاں
درویش، اقطاب، امام، مرسل یزداں
گیتی، گردوں، بہشت، دوزخ، اعراف
یہ سب ہیں مرے دل میں خروشاں وتپاں

دُنیا کو نظر اُٹھا کے دیکھا جس وقت
میزانِ خرد میں خود کو تولا جس وقت
محسوس ہُوا اپنے بدن کا مجھے وزن
میں شہپرِ تخیّل سے اُترا جس وقت -

اَلعظمۃُ للّٰہ مرا زورِ کلام
افلاک پہ ہلتے ہیں ستاروں کے خیام
میں وہ ہوں کہ دیکھتے ہی لیلائے سخن
ناقے سے اُتر کے مجکو کرتی ہے سلام

تا میری کرن سے برف اُسکی گھل جائے
جو رنگِ غلط چڑھا ہوا ہے دُھل جائے
ہر مُدعی عقل سے ملتا ہوں میں
اُس پر تا اپنی بے وقوفی کھل جائے

بھوکوں کا ہوا خواہ جو ہے خود بھی نہ کھائے
گرداب زدوں کا دوست کشتی نہ چلائے
اس منطقِ بے ہودہ کے یہ معنی ہیں
گھوڑوں کا جو ہمدرد ہو گھوڑا بن جائے

میرا ساتھی کوئی اناڑی تو نہیں
میں نے کوئی چال اُسکی بگاڑی تو نہیں
بازی کوئی جیتتا ہوں تو سوچتا ہوں
میں کوئی دغا باز کھلاڑی تو نہیں

انبوہِ الم کو ریلنے کی خاطر
ہستی کو بہ لطف جھیلنے کی خاطر
دبکا رہتا ہوں میں کمیں گاہوں میں
خود اپنا شکار کھیلنے کی خاطر

اُکھڑے نہیں آج تک لڑکپن کے خیام
سینے میں وہی دھوم ہے یارانِ کرام
میرے دل میں ہے ایک بچّہ ایسا
بڑھنے کا جو آج تک نہیں لیتا نام

ادنیٰ سا نہیں ہے مجھ کو اب اُس سے لگاؤ
کیوں نام مرے سامنے لیتے ہو ہٹاؤ
... ہاں سے وہ چلی گئی؟ کہاں؟ اور کس روز؟
اور کتنے دنوں کے واسطے؟ جلد بتاؤ

کس طرح ملے گی قصرِ حکمت کی کلید
تیری دانش کو ضعفِ معدہ ہے شدید
اے شاکیٔ نفخ، ذرّہ خوردِ بد حال
دیکھ اُس کو جو ہضم کر چکا ہے خورشید

"جی ہاں، مسجد یہیں ہے آگے بڑھ کر"
حاجی غفّار کی دُکاں کے اوپر
"لیکن لیکن" — "جناب" لیکن کیسی
"میں۔۔ پُوچھ رہا تھا کہ ہے۔۔ میخانہ کدھر"

لیلائے سُخن کے گیسوؤں کو سلجھاؤ
جو میں نہیں کر سکا، وہ تُم کر کے دکھاؤ
اللہ کرے کہ میرے کم سِن شُعرا
تم مجھ سے ہزار چند آگے بڑھ جاؤ

نوخواستہ شاعرو، ٹھٹھر جاؤ گے
تقلید یونہیں رہی تو پچھتاؤ گے
جب تک مجھے گُم نہیں کرو گے بچّو
کہتا ہوں کہ اپنے کو نہیں پاؤ گے

~~~

غاصب ہی بنوں، اور نہ محروم بنوں
لائم ہی بنوں، اور نہ ملوم بنوں
مَیں اتنا دنی نہیں کہ ظالم بن جاؤں
مَیں اتنا سُبک نہیں کہ مظلوم بنوں
~~~

سختی مرے قلب کو نہیں بھاتی ہے
آتے ہی نکل جاتی ہے جب آتی ہے
پڑنے نہیں پاتی دل میں نفرت کی گرہ
ماتھے پہ شکن ضرور پڑ جاتی ہے

میں اپنی خبر خود آپ لے سکتا ہوں
طوفاں میں خود اپنی ناؤ کھے سکتا ہوں
خود سوچئے کس منہ سے میں کچھ آپ سے لوں
جب آپ کو میں کچھ نہیں دے سکتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ دوزخ کا سزاوار ہوں میں
ثابت ہے کہ بے دین و سیہ کار ہوں میں
دُنیا ہی میں فی النّارِ سقر ہوں یعنی
انساں کی محبّت میں گرفتار ہوں میں

جذباتِ جوانی سے رہے خوار و ذلیل
تب جا کے بڑھاپے میں ہوئی عقل کفیل
پایا جب کچھ یہاں بہت کچھ کھو کر
دیکھا کہ نہیں اب کوئی جینے کی سبیل

ظاہر ہوتی ہے جب کہ مجھ پر مری ذات
پھرتی ہے مرے صحن میں خوشبوئے حیات
کاندھے پہ گلستاں کی اٹھائے ہوئے صبح
اور پُشت پہ جنگل کی سمیٹے ہوئے رات

اِس بحر میں ہے شور و تموّج کتنا
اِس رُوح میں ہے جوش و تہیّج کتنا
بچّوں کی اُچھل کود جو دیکھی تو کھُلا
ہستی میں ہے طوفان و تشنّج کتنا

اِک غیظِ نشیب و عزمِ اعلےٰ بن کر
اِک جوش و خروشِ رِفعتوں کا بَن کر
ذرّات کی — خورشید سے ٹکّر کی اُمنگ
میداں میں اُبھرتی ہے بگولا بن کر

جب چرخ پہ کروٹ سی بدلتی ہے کرن
اور رات اُتارتی ہے اپنا کنگن
دھندلے کھیتوں غنُودہ میدانوں میں
سُنتا ہوُں دِلِ ارض و سما کی دھڑکن

بیداں راتوں کو جب کہ ہوتے ہیں سیاہ
ہو جاتی ہے جذب یوں فضاؤں میں نگاہ
خود اپنے پہ ہوتا ہے گماں بعض اوقات
جیسے کوئی اجنبی ہے میرے ہمراہ

جس شے کی بھی پڑ رہی ہے سینے پہ لکیر
وہ تختِ شعور بن رہی ہے تصویر
جو عکس لرز رہے ہیں بیداری میں
خوابوں کی گھٹائیں کر رہے ہیں تعمیر

اک واعظ کی محفل سے پلٹ کر سرِ شام
میں نے جو جھجک کے ساتھ اُٹھایا کل جام
تو بڑھ کے مشیّت نے کہا "اے مرے لال
پی، مردِ حلالی پہ نہیں ہے یہ حرام"

چنگیز کا مِٹ جائیگا سب لاف و گزاف
نسل اُس کی جلائیگی چراغِ انصاف
جو آج مرے خلاف ہیں گرمِ جہاد
مجھ کو پوجیں گے کل انہیں کے اخلاف

یُوں بینک میں کس لئے کھڑا ہے حیراں
نوٹوں کی طرف نگاہ، چہرے پہ دھواں
جُوں دام میں پھڑپھڑا ئے جنگلی کوّا
تیری آنکھوں میں یُوں ہوس ہے غلطاں

ہر پور مری، کوہ کے گزسے نپ جائے
ہر کیل مری نشتر کی لو میں تپ جائے
ہر دل کی تمنّا ہے کہ میرا ذرّہ
اخبار میں آفتاب بن کر چھپ جائے

اِک دفترِ واقعات گویا ہوں میں

لوحِ اشکال و ظرفِ اَسما ہوں میں

ہر شخص کا نام، چہرہ، گھر یاد رہے

انساں نہیں، حافظے کا پیپا ہوں میں

شعرِ خالص کا لُطف کیونکر پاتے

جو رُوح میں تھے، وہ گیت کیونکر گاتے

صد حیف کہ تُرش ہو گیا شہدِ خیال

الفاظ کی بوتلوں میں آتے آتے

شعروں کا مزا بگاڑ دیتی ہے زبان

مٹتا ہے یقین، اور اُبھرتا ہے گمان

لفظوں کی کسوٹی پہ زرِ معنیٰ کو

گھستا ہوں تو پڑ جاتے ہیں پیتل کے نشان

ہر سانس میں کیا ٹیس ہے اللہ غنی

سینے میں کھٹک رہی ہے ہیرے کی کنی

مابینِ کشاکشِ یقین و تشکیک

اللہ ری خیالات کی اعصاب شکنی

۳۲۴

شاہی کی ہوس میں کی گدائی ہم نے
اکسیر کی دُھن میں خاک اُڑائی ہم نے
جب زہر کے ہضم کر چکے سو قلزم
تریاق کی ایک بوند پائی ہم نے

اِک عمر کے بعد اُفق ہمارا چمکا
رُخسارۂ یار ماہ پارا چمکا
جب روتے بقدرِ صد نظامِ شمسی
تب ایک تبسم کا ستارا چمکا

فانی[1]، شاعر[2]، رفیع[3]، مانی[4]، آزاد[5]

ان پانچ کے دم سے بزمِ جاں تھی آباد
سب آج تہ خاک ہیں اِلّا مانی
اے مُردہ ذی حیات مانی فریاد

امید اب بھی ہے قصرِ ہستی کی کلید؟
یک ذرّہ امید اب بھی ہے کیا صد خورشید؟
ڈوبی وہ کمر، سینہ، گلا ـــ زیریں لب،
اب بھی ہے اُمید؟ "ہاں ابھی تک ہے اُمید"

بدایونی مرحوم [2] آغا شاعر قزلباش مرحوم [3] رفیع احمد خاں مرحوم [4] مانی جائسی موجود مرحوم
[5] آزاد ـــ مرحوم

جادوئے نمو خاک پہ چل جاتا ہے
ارمانِ زمین کا نکل جاتا ہے
جھک جاتے ہیں مجرے کیلئے شمس و قمر
صہبا میں جب انگور بدل جاتا ہے

صحرا سے گزرتے ہوئے دریا نے کہا
قُلزم مجھے دیکھے گا تو ڈر جائے گا
قُلزم نے جو دیکھا تو کہا نرمی سے
سو جاؤ بہت تھکے ہوئے ہو بیٹا

دُنیا کے بڑے پیر کا ہے یہ دربار
ظاہر ہے کہ اس شکل سے پائے گا نہ بار
سر پر ترے رہتا ہے جو اک ہالۂ عقل
جُوتے ہی نہیں اپنا وہ ہالہ بھی اُتار

وہ دَورِ محبّت تھا یہ عصرِ افکار
کل سینہ تھا چاک چاک اب سر ہے فگار
وہ دورِ شباب تھا یہ ہے کلفتِ شیب
وہ شامِ غریب تھی یہ صُبحِ میخوار

اللہ ری تلخ تجربوں کی بوچھار
شمشیرِ شرافت کی مُڑی جاتی ہے دھار
محسُوس یہ ہوتا ہے کہ میری نیکی
میرے دل میں ہے خودکشی پر تیار

بہتر ہے، سُنوں گا جب کبھ حضرت کا بیان
چُپکا بیٹھا رہوں گا، گویا حیوان
جیسے ہی کہ فرش پر قدم رکھونگا
جُوتوں سے بھی قبل م اتار ڈالونگا زبان

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو
قاموس و لغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پہ نہیں اڑتے معنی
الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھو

(ب)

معلوم ہوئی سعی کی جب حد مجکو
تمکین کی حاصل ہوئی مسند مجکو
مقصد کو میں کل ڈھونڈ رہا تھا اے جوشؔ
خود ڈھونڈ رہا ہے آج مقصد مجکو

یوں جشن کا فرمان دیا ہے تو نے
ہر موج کو طوفان دیا ہے تو نے
ہم پر طرب و مستی و رنگینی کو
خیموں کی طرح تان دیا ہے تو نے

ہلکی ہلکی پھوار بادل لائے
جھومے، لوٹے زمیں پہ ٹھنڈے سائے
ہستی کے تعیّنات چکرا کے گرے
مستی کے تصوّرات سر پر چھائے

مہکی ہوئی زندگی ہے، آؤ مہکیں
پانی کے دھوئیں میں آگ بن کر دہکیں
لہکی بوچھار ہے، بہکتی پُروا
اس گونج میں آؤ ہم بھی لہکیں بہکیں

اے زمزمۂ بادہ گُساراں، آجا
اے فتنۂ انگبیں عذاراں، آجا
ایسے میں کہ چاندنی ہے گوہر افشاں
اے مشعلۂ قمر شکاراں، آجا

زُلفوں کی مہک ہے، نرم جھونکوں کی سنک
مُڑتی ہوئی کشتی میں ہے شیشوں کی کھنک
واللہ کہ میں بندہ نہیں ہوں اِس وقت
پہلو میں ہے اک زُہرہ جبیں سر پہ دھنک

اے کعبۂ ذوقِ دید و اے دیرِ نگاہ
اے راہ زنِ انجم و غارت گرِ ماہ
کیا تیرہ شبی کا اُس مسافر کو ہو خوف
تیرے چہرے کی لَو ہے جس کے ہمراہ

کس ناز سے گلشن میں ٹہلتی ہوئی آئی
سانچے میں شگفتگی کے ڈھلتی ہوئی آئی
کلیوں کی گرہ کھل گئی جب وہ دمِ صبح
آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملتی ہوئی آئی

تابِ زر و سیم، حسنِ بُتاں پہ نثار
رنگینیِ صبح، روئے خوباں پہ نثار
صد جامۂ زہد و صد قبائے سلطاں
آزاد کے اِک چاکِ گریباں پہ نثار

صد دیر و حرم، کنشتِ خُم پر قرباں
صد باغِ اِرم، بہشتِ خُم پر قرباں
صد پرچم و اورنگ و عصا و دیہیم
یک ذرّۂ پاکِ خشتِ خُم پر قرباں

ترائی ہوئی ہے تازہ پھولوں کی مہک
سبزے میں ہے اضطراب پودوں میں لچک
گھر سے چلا ہے کون گلشن کی طرف
وشوں میں فتادگی ہے کلیوں میں ہمک

ے پھول، صبا ہمیشہ مہکائے تجھے
ے چاند، گھٹا کبھی نہ سنولائے تجھے

س نیند بھرے لوچ سے للہ نہ چل
رتا ہوں کہیں نظر نہ لگ جائے تجھے

اے دلبرِ سیم تن، نگارِ گُل فام
اے تجھ میں فسونِ صُبح و افسانۂ شام
مابینِ زرِ مہر و طلائے مہتاب
مکھڑا ہے ترا مصالحت کا پیغام

بن جاتا ہے ہر کوہِ گراں اِک پرِ کاہ
گِر جاتی ہے صد سالہ عبادت کی کُلاہ
دل کیا یخ و شبنم سے نکل پڑتی ہے تو
بھرپور جوانی جب اُٹھاتی ہے نگاہ

نادیدہ فضا میں پیچ و خم کھاتا ہوں
تا دیر خود اپنے کو نہیں پاتا ہوں
جب اُن کے بدن کو چھو کے آتی ہے صبا
اک طرفہ دھندلکے میں پہنچ جاتا ہوں

کلیاں چونکی ہیں مسکراؤ تم بھی
شاخوں میں لچک ہے رسماؤ تم بھی
ہاں باندھ رہی ہے رات جوڑا اپنا
ماتھے سے خنک لٹیں ہٹاؤ تم بھی

زُلفوں کو ہٹا کے کُن مُنا یا کوئی
فرشِ مخمل پہ رس مسایا کوئی
جیسے کُندن پہ چاندنی کی لہریں
یوں چونک کے صبح مُسکرایا کوئی

چلتا ہوا صبح کا یہ جادو توبہ
ناشُستہ یہ رُخ کھُلے یہ گیسو توبہ
چہرے سے دُلائی کے سرک جاتے ہی
انفاسِ جوانی کی یہ خوشبو توبہ

چادر کی ہر اک شکن دہک جائے گی
تکیے کی ہر اِک کلی چٹک جائے گی
اے مستِ شباب یوں مچل کر دمِ صبح
انگڑائی نہ لے، جِلد مسک جائے گی

کیونکر نہ ہوائیں منہ اندھیرے لہکیں
کس طرح نہ ڈوبتے ستارے بہکیں
گل رنگ بدن میں رات کے ہار کا رس
اور رات کے ہار میں بدن کی مہکیں

اِتنی تب و تاب، اور سویرے، یہ کیا
اک آنچ سی اور مُنہ اندھیرے یہ کیا
بل کھا کے یہ انگڑائی، اَیلتی انگڑائی
اور پھر یہ پھُریری سی، ارے رے، یہ کیا

یکبارگی جھِل مِلائے طاقوں میں دیئے
تاروں نے لرز کے اپنے در بند کیے
چُٹکی اُن کی نقاب اُلٹنے کو اُٹھی
نکھری ہوئی چاندنی نے پَر تول لیے

ہر روح کا بھید کھولتی ہے اے جاں
پلکوں پہ جو راز تولتی ہے اے جاں
مجبور ہوں کیونکر اُس محبت کو چھپاؤں
آنکھوں میں جو آکے بولتی ہے اے جاں

جاں کو اذنِ وداع دیتی ہے سحر
سینے کو جنوں شعاع دیتی ہے سحر
تُو نے جو مجھے دیا ہے سب سے پہلے
اُس درد کی اطلاع دیتی ہے سحر

مہ پارہ و مہ رُخ و منوّر تُم ہو
میری نظروں میں سب سے بہتر تُم ہو
اوروں کا جمال ہے مرے پاؤں کی پھانس
جو دل میں ہے پیوست وہ خنجر تم ہو

چونکا وہ ندی کا ناز، ساحل کا نیاز
جاگا وہ فضا پہ بھیرویں کا اعجاز
گُل برگ پہ شبنم کی وہ چھاتی دھڑکی
آئی وہ کرن کے پھوٹنے کی آواز

پھوٹی وہ کرن، زمین وہ بیدار ہوئی
آمادۂ رقص و رنگ و رفتار ہوئی
اک لوچ سے وہ ناخنِ مطرب نے چھوا
ہستی کے ستار میں وہ جھنکار ہوئی

وہ مست گھٹائیں گن گناتی آئیں
وہ سرد ہوائیں بن سناتی آئیں
شاخوں کی نزہت کے ساتھ رس کی بوندیں
آئیں وہ چمن میں جھم جھم چھماتی آئیں

(ج)

تیرے آگے ہے ایک عالم مردود
مذموم ہے خلق، صرف شاعر محمود
دُنیا پہ یہ مشقِ جور، مجھ پر یہ کرم!
اور اس پہ اُمیدِ شکر، کیوں اے معبود!!

"معبود، یہ نورِ کرم، اور میری جبیں!"
"تو مستحق اس کا ہے مرے عبدِ مُبیں"
"لیکن تیرے غریب لاکھوں بندے؟"
"کیا تو نے کہا، زور سے کہ "کچھ بھی نہیں"

(۷)

ہاں، خون کے گھونٹ پی رہا ہوں اے دوست
دل کے زخموں کو سی رہا ہوں اے دوست
گویا سرِ کوہ ایک تنہا پودا
یوں اپنے وطن میں جی رہا ہوں اے دوست

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

محرومِ ہوائے زندگی ہوں اب تک
پامالِ خرئی و ابلہی ہوں اب تک
اس درد کا تو گواہ رہنا اے وقت
میں اپنے وطن میں اجنبی ہوں اب تک
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

پوشیدہ عدن کو تو بہت ڈھونڈ چکا
نادیدہ چمن کو تو بہت ڈھونڈ چکا
شاید میرا وطن مجھے اب ڈھونڈے
میں اپنے وطن کو تو بہت ڈھونڈ چکا

پھر پائی نہ دادِ جاں نثاری ہم نے
کی پچھلے پہر پھر اشکباری ہم نے
اے سخت فریب و سست پیماں فریاد
یہ رات بھی آنکھوں میں گزاری ہم نے

اس وقت کہ آنسوؤں کی آنکھوں میں ہے رو

ہر ولولہ سرنگوں ہے ظلمت ہے نہ ضو

الٹا نظر آ رہا ہے یہ تختۂ خاک

اشجار کا آب جو میں جیسے پرتو

اے پچھلے پہر کے بے قرارو ٹھہرو

بشکستہ دلوں کے غمگسارو ٹھہرو

تھم تھم کے ٹپک رہے ہیں آنسو میرے

اے تیز قدم رات کے تارو ٹھہرو

یادوں کی بندھی زلف بکھر جاتی ہے
بھولی ہوئی ہر شکل اُبھر جاتی ہے
لیتا ہوں جو جھٹپٹے میں اک گہری سانس
ماضی کی اَنی دل میں اُتر جاتی ہے

پھر درد بھرے گیت خموشی نے سنائے
پھیلے پھر رات کے در و بام پہ سائے
بیتے لمحے وہ تیر جوڑے اُبھرے
بھولے چہرے وہ آگئے ڈنک اٹھائے

کیا ہجر کے طوفان میں گھبراتی ہے نیند
پلکوں کے قریب آ کے پلٹ جاتی ہے نیند
ہیرے سے بلور جیسے کٹ جاتا ہے
یوں دھارے سے کروٹوں کی کٹ جاتی ہے نیند

ماضی سے خلش اُدھار لیتا ہوں میں
ڈوبے دل کو اُبھار لیتا ہوں میں
چن لیتا ہوں حافظے سے اک یاد کا ڈنک
اور دل پہ وہ ڈنک مار لیتا ہوں میں

سب بے خور و بیخواب ہیں کس سے پوچھوں
ہر رُوح میں گرداب ہیں کس سے پوچھوں
اشکوں میں چمک رہے ہیں جن کے چہرے
کس سمت وہ احباب ہیں کس سے پوچھوں

سانسیں وہ مہکتی، وہ چٹکی باتیں
وہ برف سے جاڑے، وہ دھواں برساتیں
کس دیس میں جا کے بس گئی ہیں یا رب
صبحیں وہ سہانی، وہ سلونی راتیں

دیتا نہیں بوستاں سہارا مجکو
کرتی نہیں بلبل بھی اشارا مجکو
مُرجھائے ہوئے پھول نے حسرت سے کہا
اب توڑ کے پھینک دو خدارا مجکو

راحت کی تمام دن نکالیں راہیں
تا شب کو وہ مل جائے جو کچھ ہم چاہیں
جب ہار خوشی کا گُندھ چکا تو دیکھا
گردن میں پڑی ہوئی ہیں غم کی باہیں

بہتر تھا فریب کا نہ جادو ہوتا
عشوے کی جگہ درد کا پہلو ہوتا
ہونٹوں پہ بجائے امواجِ تبسم کے عوض
تیری آنکھوں میں کاش آنسو ہوتا

سر میں ہے وفورِ بارِ حرماں سے دھمک
سینے میں ہے بیشمار چھالوں کی تپک
چکرا کے کبھی کا گر چکا ہوتا میں
دل میں تری زلفوں کی جو ہوتی نہ مہک

تا قبر پہ ناقدانِ گل پھول چڑھائیں
خوبانِ صدف عذار موتی برسائیں
کہتا ہے مرا وطن کہ از راہِ کرم
حضرت اب انتقال فرما جائیں

کیا واقعی چاند رات کہتے ہیں اسے
سرمایۂ انبساط[1] کہتے ہیں اسے
خاکم بدہن "موت" کہینگے کس کو
معبود! اگر "حیات" کہتے ہیں اسے

[1] اس قبیل کے ہم صوت قوافی میرے نزدیک جائز ہیں۔

اب نالۂ و فریاد نہیں کرتی ہو

اب مجھ سے کچھ ارشاد نہیں کرتی ہو

اُس دَور کو جب تم نہیں تھی خود چاہ مری

بھُولے سے بھی اب یاد نہیں کرتی ہو

اللہ کرے بزیر چرخِ کج خُو

یوں پھر ہو کبھی مرحمتِ بختِ نکُو

پہلو میں ہو اُس بستہ بدن کی گرمی

ہونٹوں میں ہو اُن تازہ لبوں کی خوشبو

سب کام یہاں بن کے بگڑ جاتے ہیں
گھر بستے ہیں، اور بس کے اُجڑ جاتے ہیں
جیسے پانی میں بُوندیوں کے حلقے
یُوں مل کے ہم آپس میں بچھڑ جاتے ہیں

احباب کے جم گھٹے ہیں اور ہے شب رات
شمعوں سے اُبل رہے ہیں الوانِ حیات
اُس وقت تک آندھی نہیں آتی جب تک
یکجائی کا لطف اُٹھا رہے ہیں ذرّات

سنگ فرقت سے چور ہونا ہے ہمیں

بے بادہ و بے سرور ہونا ہے ہمیں

گھبرا گھبرا کے مِل لو یارانِ قریب

اب چند نفس میں دور ہونا ہے ہمیں

راحت کا جہاں میں کوئی امکان نہیں

کس بحرِ طرب میں غم کا طوفان نہیں

دیکھو کسی حسّاس کو بشّاش اگر

تو سمجھو کہ وہ دیو ہے، انسان نہیں

ہر کوہِ گراں مملکت کاہ میں ہے
ہر نغمۂ خوش سلطنتِ آہ میں ہے
شمعوں نے کئے ہیں نصب خیمے سرِ کوہ
کس دل سے کہوں تُند ہوا راہ میں ہے

ہر لطف کو اک عذاب پاتا ہوں میں
ہر عیش کے بعد اشک بہاتا ہوں میں
بازارِ فغاں میں شب کے نغمے لے کر
ہر صبح فروخت کرنے جاتا ہوں میں

سرگشتہ و زار و نیم جاں ہے لیلیٰ
سر تا بقدم سوزِ نہاں ہے لیلیٰ
اُس دشت میں اب عشق خراماں ہے جہاں
مجنوں کی تلاش میں رواں ہے لیلیٰ

ہر گام پہ ہے جنگ و جدل کی وادی
ہر موڑ پہ ہے امن و اماں فریادی
آپ اور یہ عہدِ جہل و عصرِ وحشت
افسوس ہے اے جوشِ ملیح آبادی

ہاں خونِ جگر سے کر چکا ہوں چھڑکاؤ
میدان ہے تم نظر جہاں تک دوڑاؤ
اب ابلقِ ایّام کہاں جاتا ہے
میں باگ لگا رہا، تم کاٹھی لاؤ

میں اُن سے نظر مِلا کے کیونکر پلٹا
افسُردہ و آزردہ و مُضطر پلٹا
اُس بزم میں اپنی آگ دہکا کے گیا
اُس بزم سے اپنی راکھ لے کر پلٹا

جب صبح نے مسکرا کے موتی برسائے
پھولوں میں بھری شراب پودے لچکائے
دیکھا کہ سحر کی پشت پر شامِ بلا
لیٹی ہے مزے سے پاؤں اپنے پھیلائے

دل کو کوئی ضربِ غم سے کس طرح بچائے
جب کھل کے ہنسے آنکھ میں آنسو بھر آئے
دیکھا کہ جہاں بھی ہے چراغاں کی بہار
بیٹھے ہیں وہیں پالتی مارے ہوئے سائے

محمد شریف عباسی چاکواڑہ میرٹھ ہند۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء

اے جانِ من

اے جان من

جانانِ من　　　　اے جانِ من

(۱)

اے نورِ بزمِ این و آں

اے انجمِ چرخِ مکاں

اے شمعِ محرابِ زماں

اے مشعلِ طاقِ زمن

اے جان من　　　　اے جان من

جانان من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من   اے جانِ من

(٢)

اے صدرِ بزمِ رنگ و بو

اے صبحِ دیر و شامِ جو

اے دلبرِ آئینہ رو

اے خسروِ شیریں سخن

اے جانِ من   اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من　　اے جانِ من

(۳)

مکھڑا ترا نورِ حرم

آنکھیں تری بیت الصنم

تیرا ہر اک نقشِ قدم

نسریں۔ بنفشہ۔ نسترن

اے جانِ من　　اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جان من

اے جان من

جانانِ من اے جان من

(۴)

اے لعلِ بحرِ مدعا

اے دولتِ رنگ و صدا

اے جوھرِ گیتی بہا

اے گوھرِ گردوں تمں

اے جان من اے جاں من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جان من

اے جان من

اے جان من

جانان من

۵

جادو نگاہ و خوش بیاں

مہتاب بار و خور فشاں

عنبر فروش و مے چکاں

گوھر جبیں و گل بدن

اے جان من

اے جان من

جانان من

اے جان من

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من   اے جانِ من

(۶)

اُمڈی ہوئی رعنائیاں

کھلتی ہوئی رعنائیاں

اُف رے تری رعنائیاں

اللہ رے تیرا بانکپن

اے جانِ من   اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من

(۷)

اے مقصدِ ناز و ادا

اے چشمۂ رقص و غنا

اے شاہدِ ابر و صبا

اے دلبرِ گنگ و جمن

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جاناں من — اے جانِ من

۸

اے بحر میں غلطاں گہر

اے نہر میں رقصاں قمر

اے دل کو برماتی نظر

اے اوس میں ڈوبی کرن

اے جاں من — اے جاں من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من   اے جانِ من

(۹)

اُبٹن سے اے مہکی بنی

اے سانس لیتی چاندنی

اے رس میں ڈوبی پدمنی

اے نیند کی ماتی دُلھن

اے جانِ من   اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من　　اے جانِ من

(۱۰)

روشن رخِ گل گوں ترا

دیکھو جسے مفتوں ترا

ہر دل پہ ہے افسوں ترا

نو بُت ہے، دنیا رہیں

اے جانِ من　　اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جان من

جانانِ من   اے جانِ من

(۱۱)

بر میں شلوکا تنگ ہے

کلیوں کا جس میں رنگ ہے

ہر پھول جس سے دنگ ہے

گل ہے چراغِ یاسمن

اے جان من   اے جانِ من

جانانِ من

اے جان من

اے جاں من

اے جاں من

جاناں من　　　اے جانِ من

(۱۲)

اے تو حنیٔ بادِ صبا

اے جبلتِ رنگِ حنا

اے آہوئے دشتِ خطا

اے دولتِ مشکِ ختن

اے جانِ من　　　اے جانِ من

جاناں من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من　　　اے جانِ من

(۱۳)

جستجو میں تری اے شعلہ خو

خانہ بخانہ کو بہ کو

خم تیرے قد کے روبرو

شمشاد و سرو و نارون

اے جانِ من　　　اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جاناں من   اے جانِ من ،

(١٤)

اے یارِ عالم آشنا

اے تیغِ مرہم آشنا

اے مہر شبنم آشنا

اے جوئے جوں، اہر لس

اے جانِ من   اے جانِ من

جاناں من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من　　　اے جانِ من

(۱۵)

قوسِ قُزح ابروئے تو

شامِ اودھ گیسوئے تو

صبحِ بنارس روئے تو

اے ماہِ نسریں پیرہن

اے جانِ من　　　اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من　　　　اے جانِ من

(۱۶)

اے لوئے گلہائے ارم
اے جوئے بادِ صبحدم
اے اوجِ عمرِ بارہ رم
اے موجِ صہبائے کہن

اے جانِ من　　　　اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جان من

اے جان من

جانانِ من　　　　اے جان من

(۱۷)

اے معدنِ لعل و گہر

اے مخزنِ شمس و قمر

اے معبدِ شام و سحر

اے کعبۂ سرو و سمن

اے جان من　　　　اے جان من

جانان من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جاناں من   اے جانِ من

(۱۸)

انکار میں زخمِ نہاں

اقرار میں درمانِ جاں

رفتار میں آبِ رواں

رخسار میں صبحِ چمن

اے جانِ من   اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من اے جانِ من

(۱۹)

آواز میں ناز و نمو

انداز میں چاک و رفو

آغاز میں جام و سبو

انجام میں دار و رسن

اے جانِ من اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جان من

اے جاں من

جاناں من　　　　اے جان من

(۲)

سر پہ دوستا لا سُرمئی

پیکر میں خوشبو اگر ئی

لب سرخ، ہیڈا ممپئی

کالی لٹیں، گورا بدن

اے جاں من　　　　اے جاں من

جاناں من

اے جاں من

اے جانِ من

اے جانِ من

جانانِ من　　　　اے جانِ من

(۲۱)

اس آیتِ انوار سے

اس مصر کے بازار سے

اِس روئے گوہر بار سے

برخیز و برقع برفگن

اے جانِ من　　　　اے جانِ من

جانانِ من

اے جانِ من

اے جاں من

اے جان من

جانان من　　　　اے جان من

(۲۲)

جو دے سجھے، اس مول دے

تا دور موتی رول دے

تا لوں پراسرار تو کھول دے

رلعب تک اندر سکن

اے جاں من　　　　اے جاں من

جانانِ من

عارضی حکومت کے حلفِ وفاداری پر

دو نعرے

جیل کے اندر اور جیل کے باہر

(ا)

جیل کے اندر

ہاں میں باغی ہوں وہ باغی برق دوز و شعلہ باف
سانس جس کی ڈالتی ہے طاقِ کسریٰ میں شگاف

ہاں وہ باغی ہوں وہ باغی فاتحِ مرگ و حیات

کانپتی ہے عزم سے جس کے بنائے کائنات

ہاں وہ باغی ہوں وہ باغی مرکزِ برق و شرار

جس کے آگے چھوٹنے لگتی ہے نبضِ شہریار

ہاں وہ باغی ہوں کہ سن کر جس کا حرفِ انقلاب

چُغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

موت گر پڑتی ہے میرے سامنے کھا کر پچھاڑ

میری ٹھوکر کے تصور سے لرزتے ہیں پہاڑ

آسماں لے کر وٹیں، وہ انقلابی راگ ہوں

جس نے لنکا کو جلا ڈالا تھا میں وہ آگ ہوں

"رخصت اے زنداں، جنوں زنجیر در کھڑکاتے ہے
مژدۂ تاج و تخت پھر ٹھوکر مری کھجلائے ہے"

۲

جیل کے باہر

عزمِ سنگینِ شکستِ بابِ زنداں کی قسم
حُریت کے جذبہائے شعلہ افشاں کی قسم
نامور اجداد کے خونِ شرافت کی قسم
اپنی خودداری کی سوگند، اپنی عزت کی قسم

ہاں قسم کھاتا ہوں میں ٹیپوے عالی جاہ کی

ہاں قسم کھاتا ہوں میں قبر بہادر شاہ کی

ہاں قسم کھاتا ہوں میں اس فاقہ کش بنگال کی

روح جس کی سو رہی ہے چادر اوڑھے کال کی

آج بھی ہیں سرخیاں جس میں دلوں کے داغ کی

ہاں قسم کھاتا ہوں اس جلیانوالہ باغ کی

عزمِ رانی کی قسم اور روحِ جھانسی کی قسم

ہاں بھگت سنگھ اور اس "باغی" کی پھانسی کی قسم

حشر تک خادم رہوں گا دلوِ استبداد کا

جارح کی اولاد، در اولاد، در اولاد کا

والیانِ ملک سے کبھی میں نہوں گا بدلگام
باپ کا چاکر رہوں گا اور بیٹے کا غلام
مل" کے آقاؤں کا یہی یاور رہوں گا حشر تک
چٹکیاں لینا ہے میرے خون میں جن کا نمک
آبِ زر سے لکھے گی تاریخ یہ دن آج کا
آج سے ہوں بندۂ بے دام تخت و تاج کا
کیوں نہ سکہ ہند میں ہو بے دھڑک جاری مرا
شاہ کے لطفے سے ہے عہدِ وفاداری مرا
فرشِ پا انداز شہ کو دیر ہونا تھا مرا
شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا مرا